ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۳۰ر نومبر ۱۹۹۲ء

☆ صاحب صدر! اس بڑھاپے میں ہی ایک نیکی کمالیجئے (خطاب جم
☆ لانگ مارچ ... کیا کھویا کیا پایا؟ (تجزیہ)
☆ نظام خلافت کے خدوخال پر شق وار تبصرہ (سیاست خلافت پر مذا

لانگ مارچ پر تنظیم اسلامی کا موقف

پاکستان کا بقاء و استحکام اسلام سے وابستہ ہے جو صرف انقلاب کے راستے آئے گا۔ اس سے پہلے پہلے ان میں ملوث ہوئے بغیر ہم سیاسی عمل اور مروجہ جمہوریت کی تائید کرتے ہیں تو اس لئے کہ وہ شاخ تور ہے جس پر آشیانہ بنانے کا ارادہ ہے۔

موجودہ حکومت کا مینڈیٹ مشکوک تھا' پھر ختم ہوا اور اب تو یہ اپنا جواز بالکل ہی کھو چکی ہے۔ اس کی دو وجوہ پہلے سے موجود تھیں' تیسری کا اضافہ پی ڈی اے کے نام نہاد لانگ مارچ پر سرکار کے غیر دستوری اور غیر قانونی رد عمل کی شدت نے کر دیا ہے۔

پی ڈی اے کا لانگ مارچ ایک جوا ہے جو بے نظیر نے سادگی میں یا کسی "بالائی" اشارے پر کھیلا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت منفرد ہے کہ پچھلی سب سیاسی تحریکوں کے برعکس یہ کسی بھی دینی مذہبی جماعت کے اشتراک عمل کے بغیر خالص سیکولر عناصر کی چلائی ہوئی اور اس اعتبار سے شناختی کارڈ پر مذہب کے اندراج کے خلاف احتجاج کا تسلسل ہے۔

آئی جے آئی کی حکومت کی بے تدبیری سے یہ تحریک خون خرابے میں بدلتی نظر آتی ہے جس کے دونوں نتائج ہولناک ہوں گے۔ مارشل لاء آیا تو وہ بھی ملک و قوم کے حق میں سم قاتل ہے اور بات بڑھی تو ایک خالص سیکولر انقلاب آئے گا جو اس ملک کے جواز ہی کو ختم کر دے گا چنانچہ واحد چارۂ کار یہ ہے کہ صدر مملکت ایک خالص غیر سیاسی اور غیر جانبدار نگران حکومت کے تحت نئے منصفانہ انتخابات کے لئے فوراً ضروری قدم اٹھائیں۔

قیمت ۵ر روپے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ایک خط اور اس کا جواب

دین کے کام میں علماء کے تعاون کا حصول دشوار تو نہیں!

تنظیم اسلامی کے لئے لازم ہے کہ اپنے کام کے سلسلے میں تعاون کے لئے ہر کسی کے سامنے دست سوال دراز کرے اور علمائے دین تو اس اعتبار سے ہماری ترجیحات میں ہمیشہ سرفہرست رہے ہیں۔ ان سے تائید و نصرت ہی طلب نہیں کی گئی بلکہ مشورے کا بھی خیر مقدم کیا گیا اور رہنمائی کے لئے بھی تنظیم کے بھرپور اجتماعات کا پلیٹ فارم تک انہیں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ تنظیم کی اعلیٰ ترین قیادت کا رویہ علمائے کرام کے ساتھ نیاز مندانہ رہا اور ان میں سے بعض حضرات کی زیادتیوں کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا گیا۔ یہ طرز عمل تو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس فکر کے بارے میں ہے جس پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی اور اسی کا تسلسل ان شاء اللہ برقرار رہے گا تاہم کسی بھی مسئلہ پر عوامی حمایت کے حصول کی غرض سے علمائے دین' مساجد کے ائمہ اور خطباء کے عملی تعاون کی اہمیت کہیں زیادہ ہے جس کے لئے تنظیم کے رفقاء کو مخلصانہ کوششوں میں کبھی کمی نہیں کرنی چاہیے۔ حال ہی میں اخبارات تک مسلمانوں کے ان احساسات کو پہنچانے کے لئے تنظیم اسلامی کی طرف سے ایک مہم چلائی گئی جو رنگین صفحات اور مخرب اخلاق تصاویر کی اشاعت کے باب میں دلوں میں تو پائے جاتے ہیں لیکن زبانوں پر نہیں آتے اور یہ مہم ابھی جاری ہے۔ اس کے لئے علمائے کرام کا تعاون ضروری تھا جنہیں ہر جمعہ کو مسلمانوں تک اپنی بات پہنچانے کا بھرپور موقع ملتا ہے۔ تنظیم اسلامی حلقہ سندھ و بلوچستان کے ناظم نے اسی ضمن میں ذاتی خطوط لکھے جن میں سے ایک مراسلے اور اس کے جواب کی یہاں اشاعت سے غرض یہ ہے کہ ہمارے ساتھیوں کو اندازہ ہو جائے کہ خلوص دل سے "بر اور تقویٰ" پر تعاون طلب کیا جائے تو یہ درخواست بالعموم رد نہیں کی جاتی---(مدیر)

محترمی و مکرمی جناب مولانا محمد امجد تھانوی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ- مزاج گرامی

دین میں نہی عن المنکر کے مقام کے بارے میں آپ سے کچھ عرض کرنا گویا کہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے جس کی کم از کم احقر جسارت نہیں کر سکتا۔

آپ کو غالباً" اس کا علم ہو گا کہ تنظیم اسلامی ایک اصولی انقلابی جماعت کی حیثیت سے وطن عزیز میں غلبہ دین کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس ضمن میں ہمیں علمائے کرام کے مقام و مرتبہ کا بخوبی احساس ہے اور ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ نہ صرف ان سے برابر رابطہ رکھا جائے بلکہ ان کا تعاون بھی حاصل کیا جائے کہ اس کے بغیر دین کا کوئی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ تنظیم اسلامی کو ابھی اتنی قوت فراہم نہیں ہوئی کہ نہی عن المنکر بالید کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہو بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق الحمد للہ ہم اس فریضہ کو تقریر و تحریر اور پر امن مظاہروں کے ذریعہ ادا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

وطن عزیز میں ان دنوں ایک منظم طریقے سے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عریانی و فحاشی کو پھیلایا جا رہا ہے جس میں حکومتی اداروں کے ساتھ نجی ادارے بھی برابر کا حصہ لے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو روزانہ اخبارات میں رنگین صفحات میں خواتین کی نیم عریاں تصاویر کی صورت میں جاری ہے۔ الحمد للہ کہ تنظیم اسلامی کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اس منکر کے خلاف آواز بلند کر سکے۔ ماضی میں ہم نے روزنامہ "جنگ" اور "نوائے وقت" کے دفاتر کے سامنے مظاہروں کا بندوبست کیا اور عوام کو اس کے نقصانات سے آگاہ کرنے لئے ہینڈبل اور اشتہارات شائع کئے۔ حال ہی میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے اخبارات میں اشتہارات کے ذریعے ان سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس سلسلے کو فوری طور پر بند کریں۔

ضرورت ہے کہ علماء کرام کی طرف سے بھی اس منکر کے خلاف اخبارات پر دباؤ پڑے۔ اس کے لئے احقر آپ سے دست بستہ گذارش کرتا ہے کہ آپ اس ضمن میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال فرمائیں اور اپنے زیر اثر مساجد سے اجتماعات جمعہ میں اس منکر کے خلاف آواز بلند کرنے کا اہتمام فرمائیں۔

احقر کو توقع ہے کہ آپ تعاون علی البر کے جذبے سے کام لیتے ہوئے اس گذارش پر غور فرما کر ضروری کارروائی فرمائیں گے۔ اس ضمن میں چند سطور پر مشتمل آپ کا جواب احقر کی حوصلہ افزائی کا سبب بنے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

والسلام مع الاکرام

احقر محمد نسیم الدین

ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان

مکرمی محترمی جناب محمد نسیم الدین صاحب

ناظم تنظیم اسلامی حلقہ سندھ' شاہراہ لیاقت، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ- امید ہے مزاج گرامی بحمد اللہ بعافیت ہونگے۔

آپ کا خط حوالہ نمبر ۱۲۷۷ مورخہ ۲۰ر اکتوبر موصول ہوا جس کو پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ آپ کی تنظیم فحاشی اور عریانی کے خلاف باقاعدہ ملک میں کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی تنظیم ملک کے اندر اسلامی نظام اور اسلامی معاشرہ کو قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ میں پہلے ہی آپ کی تنظیم سے کافی حد تک جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی علمی خدمات کی وجہ سے متاثر ہوں اور ایک مرتبہ میں نے از خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کراچی میں اپنی مسجد' مسجد عظمیٰ کے ڈی اے اسکیم نمبر ا میں جمعہ کی خطابت کے لئے دعوت دی تھی اور وہ تشریف لائے تھے اور انہوں نے خطاب کے ساتھ ساتھ جمعہ کی امامت بھی فرمائی تھی۔ بہرحال میں آپ کی مساعی اور جہدوجہد کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ آپ لوگوں کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ جن امور کی طرف آپ نے اپنے خط میں توجہ دلائی ہے' ان شاء اللہ اس پر پورا عمل کرنے کی کوشش بھی کرونگا۔

آپ کا مخلص

(محمد امجد تھانوی)

الاحمد مینشن بلاک ۱۳-بی' گلشن اقبال کراچی

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور

جلد ۱ شمارہ ۴۲-۴۳
۳۰ نومبر ۱۹۹۲ء

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
مرکزی دفتر: ۶۷-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
مقامِ اشاعت
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون :- ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد۔ طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ : -/۵ روپے

سالانہ زر تعاون (اندرون پاکستان) -/۲۰۰ روپے

زرتعاون برائے بیرونِ پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۲۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۵ 〃 〃
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۲۰ 〃 〃
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۳۰ 〃 〃

افتتاحیہ

خسارے کا سودا

۱۸ نومبر کو پی ڈی اے کی طرف سے پیپلزپارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کی طرف سے "لانگ مارچ" کا اعلان بے وقت کی راگنی معلوم ہوا تھا کیونکہ اگرچہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اگست ۹۰ء میں صدر مملکت کی طرف سے ان کی حکومت پر شب خون مارا گیا' پھر عام انتخابات میں ان کی پارٹی کے ساتھ ہاتھ ہوا اور پچھلے دو برسوں میں آئی جے آئی کی حکومت کی طرف سے وہ کون سی زیادتی ہے جو ان کی ذات اور جماعت پر روا نہ رکھی گئی ہو تاہم کوئی فوری مسئلہ ایسا کھڑا نہ ہوا تھا جس پر رائے عامہ کو اس درجہ متحرک کیا جاسکتا کہ اسلام آباد میں دھرنا مار کر بیٹھنے اور ایوان صدر' وزیراعظم ہاؤس اور پارلیمینٹ کے گھیراؤ کے لئے ملک کے کونے کونے سے کھنچ کر وہاں پہنچ جاتے سوائے اس کے کہ خود ان کے صبر کا پیمانہ شاید لبریز ہوگیا تھا۔ چنانچہ اگر کچھ صحافیوں اور سیاسی دانشوروں کی طرف سے اسے ایک بہت بڑا جوا قرار دیا گیا تو یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

عام خیال یہ تھا کہ پیپلزپارٹی لاکھ سوا لاکھ آدمیوں کو اسلام آباد میں جمع کرنے میں کامیاب ہوجائے گی اور اس جلسے جلوس کے بعد جس کی کچھ نہ کچھ رونق ہنگامے پر بھی موقوف ہوتی ہے' یہ مجمع چھٹ جائے گا۔ اسے زیادہ سے زیادہ ویسا ہی ایک جلسہ سمجھا جاتا جیسے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں پی ڈی اے نے متعدد مقامات پر کامیابی سے منعقد کئے اور جنہیں پنجاب کے درویش وزیراعلیٰ "جلسیاں" اور "جلوسیاں" قرار دیتے رہے ہیں۔ رہی یہ ہانک کہ "ہم ان ایوانوں پر قبضہ کرلیں گے" تو یہ کہنے کی بس ایک بات تھی' بالکل ویسی ہی جیسی بے نظیر بھٹو نے ۱۹۸۶ء میں پاکستان واپسی پر لاہور میں اپنے شاندار عوامی استقبال کے موقع پر کہی کہ ہم چاہتے تو گورنر ہاؤس پر قبضہ کرسکتے تھے۔ لیکن یہ لانگ مارچ حکومت کے "رانگ" رد عمل اور بے جا گھبراہٹ میں "ڈانگ بازی" پر اتر آنے کے باعث ایک موثر سیاسی تحریک میں بدلتا نظر آرہا ہے۔ نواز شریف صاحب کی بظاہر بہت مضبوط حکومت بدک سی گئی ہے اور اس سے وہ بدحواسیاں سرزد ہو رہی ہیں جن کی بازگشت دور ونزدیک سنی گئی اور بین الاقوامی سطح پر بھی ایک ناموافق تاثر چھوڑ رہی ہے۔

ہمارے سیاسی کلچر میں سیاسی اختلاف کو مناسب و معقول حدود میں رکھنے کا تو رواج ہی نہیں پڑا تاہم اب وہ ذاتی دشمنی کی سطح پر اتر آیا ہے اور ہفتہ رفتہ کے واقعات نے تو مرنے مارنے کے جذبات کی شدت کو ان حدوں میں داخل کردیا جہاں سے واپسی بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہوجاتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں زیادہ قصور حکومت کا ہے جس کے زعماء نے ٹانگیں توڑنے کی باتیں کیں اور عملاً سر پھوڑتے ہوئے ذرا خیال نہ کیا کہ اندھی لاٹھیاں کس مرد یا عورت پر پڑ رہی ہیں۔ ریاستی جبر و تشدد کا وہ بازار گرم کیا گیا ہے کہ پاکستان کی مختصر تاریخ میں کسی بری سے بری فاشسٹ حکومت نے بھی یہ تیور کبھی اختیار نہیں کئے۔ شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار انتظامیہ نے حزب مخالف کے کسی چھوٹے بڑے لیڈر کو نہ چھوڑا' سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا اور دلوں میں وہ گھاؤ ڈال دئے ہیں جو کبھی بھرنے نہیں پائیں گے۔ ملک کی خاموش اکثریت اب میاں نواز شریف کے ساتھ نہیں' ان لوگوں کے ساتھ ہے جن کے بارے میں قبل ازیں رائے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ پی ڈی اے کی اسمبلیوں سے استعفوں کی بلی اب تک تھیلے سے باہر نہیں آئی تھی' غلام مصطفیٰ جتوئی جیسے لوگوں نے سلطانی گواہ بن کر اپنے اعتبار میں کوئی اضافہ نہ کیا تھا' غلام مصطفیٰ کھر کی بدنامی کے داغ دھل نہیں پائے تھے' این ڈی اے کے نام سے نوابزادہ نصراللہ خاں نے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر بھان متی کا جو کنبہ جوڑا تھا اسے کسی نے توجہ کے قابل نہ سمجھا اور پیر صاحب پگاڑا کی پھلجھڑیاں بس تفنن طبع ہی کے کام آرہی تھیں کہ میاں نواز شریف کی یکسر غلط اور ناعاقبت اندیشانہ حکمت عملی نے سب کے دھونے دھو کر رکھ دئے۔ اب تو یہ دیوار پر لکھا نظر آتا ہے کہ پی ڈی اے نے گرد و غبار اڑانے کی جو ایک نیم دلانہ کوشش کی تھی' اسے ایک پھنے خانی حکومت کے زعم نے آندھی بنایا اور اب وہ اس کے عقل کے ناخن لینے سے پہلے پہلے ایک طوفان کی شکل اختیار کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ نام نہاد آئی جے آئی کا مینڈیٹ تو ختم ہو ہی چکا تھا' اس کی حکومت کے دن بھی اب گنے جا چکے ہیں۔ صبح گئی یا شام گئی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میاں نواز شریف کی اسلامی جمہوری حکومت جو کمائی ساتھ لے کر جائے گی۔ وہ دنیا میں اس کے کام آئے گی نہ عاقبت سنوار سکے گی۔ مال جو بنایا گیا' کتنے دن ساتھ دے گا لیکن اسلام اور شریعت کے ساتھ گستاخیوں اور جسارتوں کی حد تک جو پہلیں کی گئیں وہ بہت بڑے خسارے کا سودا تھا۔ ○○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الہدیٰ

سورۃ البقرہ:
(آیت ۱۴۲)

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلے سے جس پر وہ پہلے تھے'

(دوسرے پارے کی یہ پہلی آیت درحقیقت تحویل قبلہ کے اس حکم کی تمہید ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے--- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو ابتدائی سولہ سترہ ماہ بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرکے نماز ادا فرماتے رہے۔ لیکن یہ ایک عارضی معاملہ تھا اس لئے پچھلی آیات میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسماعیلؑ' حضرت اسحٰقؑ اور ان کی اولاد سب کا مذہب اسلام تھا اور حضرت ابراہیم نے مکے کی سنگلاخ وادی میں توحید کا جو مرکز تعمیر کیا وہ ان کی ساری اولاد کے لئے جس میں بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل سب شامل ہیں' مرکز اور قبلے کا درجہ رکھتا تھا' تاہم بعد میں یہود و نصاریٰ نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنالیا۔ بہرکیف ہجرت کے بعد کچھ عرصے آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی اور اس کے بعد بالآخر وہ حکم آگیا جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو انتظار تھا ہی' اور اندیشہ تھا کہ یہود اس اہم واقعے کو مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈہ کا ذریعہ بنائیں گے لہٰذا ذہنوں کو تیار کرنے کے لئے پیشگی مطلع فرمایا کہ کچھ عقل کے دشمن اب یہ واویلا کریں گے کہ ان مسلمانوں کو کیا ہوا کہ ابھی کل تک شمال کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اور آج ان کا رخ جنوب کی جانب ہے! یہ کیسا دین ہے کہ جس کا کوئی قبلہ ہی معین نہیں!!)

کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں' وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ○

(کہ اے مسلمانو' ان احمق یہودیوں کو دوٹوک جواب دو کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے لئے ہیں۔ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے ہمارا نماز پڑھنا بھی اللہ کے حکم سے تھا اور اب بیت اللہ کو قبلہ بنانا بھی اللہ کے حکم کی تعمیل کا مظہر ہے۔ ہمارا سرنیاز درحقیقت اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے آگے خم ہے۔ یہ حقیقت سامنے رہنی چاہیے کہ اللہ کسی ایک سمت میں محدود یا مقید نہیں ہے' مشرق' مغرب' شمال اور جنوب سب اسی کے ہیں' اور وہ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔ قبلے کی تعیین کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کی موجودگی صرف اس ایک سمت کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود   قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

جوامع الکلم

نماز نور ہے اور صدقہ برہان ہے۔

کہ انسان کو باطنی و روحانی سکون و اطمینان تو اللہ کے ذکر اور اس کی یاد ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اللہ کی یاد کو دل میں بسانے کا سب سے موثر ذریعہ نماز ہے۔ تو نماز درحقیقت وہ نور ہے جو دنیا کی زندگی میں ایک بندہ مومن کے باطن کو منور رکھتا اور اسے روحانی سرور عطا کرتا ہے اور آخرت میں یہی نور ایک مجسم حقیقت بن کر ظاہر ہوگا اور میدان حشر کے کٹھن مراحل میں بندۂ مومن کے لئے رہنما اور مشعل راہ ثابت ہوگا---- اور وہ صدقہ جو اللہ کے نام پر دیا جائے' اس دنیا میں بندہ مومن کے ایمان کا مظہر تو ہے ہی' آخرت میں بندے کے حق میں ایک دلیل بن کر ظاہر ہوگا)

(صحیح مسلم بروایت ابو مالک الحارث بن عاصم اشعریؓ)

لانگ مارچ پر تنظیم اسلامی کا موقف

سیاسی احتجاج کو حکومت کے غیر آئینی اور غیر اخلاقی جبر و تشدد نے ایک تحریک بنا دیا

آئی جے آئی کا مشکوک مینڈیٹ آنسو گیس میں تحلیل ہو گیا

تازہ منصفانہ انتخابات وقت کی ضرورت ہیں

مرتبہ: ریاض الحق

۲۰ نومبر کو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب جمعہ کا متعلقہ حصہ

پاکستان میں اس وقت جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کے حوالے سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ کہ ہمارے ملکی، ملی اور قومی معاملات کے بارے میں چند باتیں ایسی ہیں جو ہمارے مستقل موقف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو دوبارہ گنوا دینا مناسب ہوگا۔ پہلی بات جس میں ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں، یہ ہے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں اس کی بقاء بھی اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ استحکام تو بہت بعد کی بات ہے، اس کا باقی رہنا اور دنیا کے نقشے پر برقرار رہنا بھی اسلام پر منحصر ہے۔ یہ ہمارے نزدیک All or none law ہے۔ فزیالوجی میں ایک قانون ہے کہ کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جو اگر ہونگے تو پورے ہونگے اور نہیں ہونگے تو بالکل نہیں ہونگے درمیان کی بات نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک پاکستان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگر یہاں اسلام آتا ہے اور اسلام سے مراد صرف عبادات کا نظام نہیں جو انگریز کے دور میں بھی موجود تھا اور آج بھی ہے، برطانیہ، امریکہ، بھارت میں بھی ہے بلکہ اس سے مراد اسلام کا نظام عدل اجتماعی ہے اور نظام خلافت ہے یعنی اجتماعی زندگی کا وہی پورا اخلاقی اور سماجی ڈھانچہ جس کا ایک نمونہ تاریخ میں خلافت راشدہ کے دوران سامنے آیا۔

اگر وہی اسلام یہاں آتا ہے تو یہ ملک نہ صرف باقی رہے گا اور مستحکم ہوگا بلکہ آخری غلبہ اسلام کا نقطہ آغاز بن جائے گا۔ اگر وہ نہیں آتا تو اس میں جو دراڑیں پڑ چکی ہیں، وہ اور زیادہ گہری ہونگی۔ ۱۹۷۱ء میں یہ دولخت ہو چکا، مزید دراڑیں جو نظر آ رہی ہیں، اور گہری ہونگی اور بالآخر اس کی Balkanization ہو کر رہے گی یعنی حصے بخرے ہو کر یہ ختم ہو جائے گا۔ جیسے آج سوویت یونین کے نام سے کوئی ملک نہیں رہا، اسی طرح پاکستان کا نام بھی نقشے سے بالکل مٹ جائے گا۔ پہلی بات ہے جس پر ہمیں حق الیقین حاصل ہے۔

دوسری بات جس پر ہمیں یقین حاصل ہے وہ ہے کہ اسلام اگر یہاں آیا تو انقلاب کے ذریعے آئے گا، انتخابی ذریعے سے نہیں آسکتا۔ محض تبلیغ سے بھی نہیں آسکتا۔ ہماری اکثر و بیشتر دینی قوتیں انہی دو میں سے کسی ایک کام میں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں تبلیغی جماعت ہے جو محض تبلیغ، محض نصیحت محض فضائل کی تعلیم و تلقین، اتباع سنت، عبادت زور دینے میں مصروف ہے۔ اپنی جگہ پر یہ سب چیزیں محمود ہیں، پسندیدہ ہیں، عمدہ ہیں اور ضرور ہونی چاہیں لیکن کل کا جز ہونے کے اعتبار سے اگر ہم کل کے ساتھ موازنہ کریں تو وہ دین کا بہت چھوٹا حصہ ہیں۔ اسلام بہرحال اس طریقے سے نہیں آسکتا۔ اب یہ بات اس زمانے میں ایک اور رنگ میں بھی کہی جا رہی ہے کہ تذکیر کرتے رہو اور تعلیم، تلقین اور نصیحت کرتے رہو اور اس خیال کو ایک فلسفے کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس پر تو مجھے انشاء اللہ "نوائے وقت" کے اپنے کالم کی اگلی قسط میں گفتگو کرنی ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس طریقے سے بھی اسلام نہیں آسکتا۔ ہاں، کچھ لوگوں میں نیکی پیدا ہو جائے گی۔ انفرادی سطح پر کچھ لوگ عبادات کا اہتمام کرنے والے اور اتباع سنت کا عملی مظہر بن جائیں گے۔

اسی طرح انتخابات کے ذریعے سے تو کسی نظام کو چلایا جاتا ہے اس نظام میں کچھ بہتری ہو سکتی ہے بشرطیکہ بہتر ہاتھ مل جائیں یا دیانتدار لوگ اوپر آجائیں لیکن نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی انتخابات کے ذریعے ہرگز ممکن نہیں۔ چنانچہ اسلام اس راستے سے بھی نہیں آسکتا۔ یہ تو انقلاب کے ذریعے آئے گا اور یہی وجہ ہے کہ جو بھی ہماری بساط، استعداد اور صلاحیتیں یا ہماری محدود طاقت ہے ہم اس کو ہمہ وقت اسی کام میں لگائے ہوئے ہیں کہ اس انقلاب کی راہ ہموار ہو بلکہ جیسا کہ آج کے کسی اخبار میں ذکر موجود ہے، حنیف رامے صاحب کل میرے پاس تشریف لائے تھے کہ موجودہ سیاسی مہم میں ہمارے ساتھ تعاون کیجئے تو میں نے محسوس کیا کہ کس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ تقریباً ۲۵ برس قبل بھی ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آچکا ہے۔

وہ ایوب خان کا دور تھا اور اس کی حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوا تھا۔ ابھی بھٹو صاحب میدان میں آئے بھی نہیں تھے۔ لاہور کے کچھ دانشور بشمول ڈاکٹر مبشر صاحب، حنیف رامے صاحب، عبداللہ ملک صاحب اور یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے چند اساتذہ اور کچھ دوسرے لوگوں نے مل کر ایک گروپ بنایا تھا کہ یہ جو آمریت ہے اور فضا میں جو گھٹن ہے، اسے ختم کرنے کے لئے کام کیا جانا چاہئے اور چونکہ اس سے پہلے زمانہ تعلیم کے دوران لاہور کے کالجوں میں میرا نام نمایاں ہوا تھا

پاکستان کا بقاء و استحکام اسلام سے وابستہ ہے جو صرف انقلاب کے راستے آئے گا۔ اس سے پہلے پہلے ان میں ملوث ہوئے بغیر ہم سیاسی عمل اور مروجہ جمہوریت کی تائید کرتے ہیں تو اس لئے کہ وہ شاخ تو رہے جس پر آشیانہ بنانے کا ارادہ ہے۔

جبکہ میں اسلامی جمعیت طلبا میں ناظم اعلیٰ بھی رہا لہٰذا ان حضرات نے مجھ سے رابطہ کیا۔ ڈاکٹر مبشر صاحب خود چل کر میرے پاس دو دفعہ آئے۔ میں نے اس وقت بھی انہیں اپنا ایک مضمون تھما دیا تھا جو آج بھی "اسلام کی نشاۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوتا ہے۔ عرض کیا کہ میں نے تو اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقت کیا ہوا ہے۔ اپنے وقت' قوت اور صلاحیت کا جو کوئی حصہ بھی میرے پاس ہے اللہ کی امانت ہے' کسی اور کام میں صرف نہیں کر سکتا۔ جمہوریت مجھے پسند ہے لیکن اسلامی جمہوریت جو اسلام کے ساتھ ہی آئے گی۔ اسلام نہیں آتا تو جو جمہوریت آئے گی وہ سیکولر جمہوریت ہوگی۔ لہٰذا بحالات موجودہ جمہوریت کے لئے کوشش کرنا میرا مقصد نہیں۔ ہاں صرف تائید دوسری بات ہے' وہ آمریت کے مقابلے میں ہو سکتی ہے۔ یہی بات میں نے رائے صاحب سے کل کہی ہے اگرچہ روزنامہ "پاکستان" کی سرخی میں جو بات کہی گئی وہ کچھ مغالطہ آمیز ہے' لیکن متن کے اندر جا کر بات بڑی حد تک صاف ہو گئی۔ اسلامی انقلاب کے لئے کوئی جدوجہد ہو تو ہم حاضر ہیں بصورت دیگر ہم اپنا ایک اصولی موقف تو پیش کر سکتے ہیں جو آج کے "نوائے وقت" میں شائع شدہ میرے بیان میں آیا اور کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے لیکن باقی اخبارات نے اس کو نہیں دیا۔ روزنامہ پاکستان نے رائے صاحب کی ملاقات کی خبر تو لگائی لیکن میرا وہ بیان شائع نہیں کیا۔ بہرحال ان کے اپنے معیارات ہیں ہر کوئی معاملے کو اپنے معیارات سے ناپتا ہے کہ کیا چیز اہم ہے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔

اس اخباری بیان میں جو دوسری بات عرض کی وہ یہی ہے کہ جمہوریت کے لئے ہماری تائید حاضر ہے ورنہ پہلی بات رہی کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں اس کا بقا بھی اسلام سے وابستہ ہے۔ اسلام سے یہاں مراد اسلام کا نظام اجتماعی ہے جو خلافت راشدہ میں تھا۔ اگر وہ نظام یہاں آتا ہے تو یہ ملک نہ صرف باقی رہے گا' پھلے پھولے گا' مستحکم ہوگا بلکہ اسلام کے عالمی غلبے کا نقطہ آغاز بنے گا۔ یہیں سے پھر اس عمل کا آغاز ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو اس کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کیسے کیسے مراحل آئیں' آیا یہ تدریجاً" ہو گا یا ایک ہی ہلے میں جیسا کہ ان آیات میں آیا ہے جو میں نے تلاوت کیں' فرمایا گیا کہ اے نبیؐ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے یا خبر دی جا رہی ہے یا جس کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا دور ہے۔ اور کہہ دیجئے یہ بھی مجھے معلوم نہیں کہ ہو سکتا ہے اللہ ایک خاص وقت معین تک کے لئے مزید مہلت دے دے اس عذاب اور آخری سزاء کو ٹال دے۔ یہ پھر تمہارے لئے ایک اور آزمائش ہوگی اگر تمہارے اندر کوئی خیر ہے تو اسے بروئے کار لانے کے لئے مہلت مل جائے گی' اگر شر ہی شر ہے تو اس شر کے اور واضح ہو کر سامنے آنے کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

دوسری بات جو میں نے عرض کی وہ یہ کہ یہاں اسلام آئے گا تو صرف تعلیم' تبلیغ اور نصیحت کے ذریعے سے آئے گا اور نہ انتخابی ذریعے سے آئے گا۔ آئے گا تو انقلابی ذریعے سے آئے گا اور وہ انقلابی ذریعہ منہج انقلاب نبوی پر مبنی ہوگا۔ یہ بات جان لیں کہ اب اس میں اجتہاد ہوگا۔ اجتہاد اس نوع کا نہیں کہ آپ ماضی سے رشتہ توڑ لیں بلکہ یہ کہ اگر کوئی نئی صورت حال یا نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے جو اس سے پہلے دور نبوی اور دور صحابہ میں نہیں تھا تو اس نئے پیدا شدہ مسئلے کے بارے میں حکم شریعت کو تلاش کیا جائے یہی اجتہاد ہے۔ نئی صورت حال نہیں ہے تو اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں' پھر تو جو بھی حضورؐ اور صحابہؓ کے زمانے میں عمل تھا وہی ہمارے لئے واجب الاتباع ہے اس اصول کے تحت منہاج انقلاب نبوی میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کس کس اعتبار سے آج کے حالات عملی طور پر ان حالات سے مختلف ہیں جو اس وقت تھے اور اسی جگہ پر ضرورت ہوگی کہ اجتہاد کیا جائے۔

تیسری بات' ملکی' ملی اور سیاسی مسائل پر ہمارا یہ مستقل موقف ہے کہ جب تک وہ انقلاب نہیں آتا' سیاسی عمل جاری رہنا چاہیے۔ سیاسی عمل کو مسلمہ اور مروجہ معیارات پر جاری رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ خلا تو نہیں رہ سکتا۔ اگر یہاں وہ اسلامی انقلاب نہیں آیا تو کوئی نہ کوئی نظام تو موجود ہے اسے جمہوری ہونا چاہیے۔ مارشل لاء ہمیں منظور نہیں۔ مارشل لاء کے بارے میں ہماری ایک پختہ رائے ہے جو میں ذرا تفصیل سے بیان کروں گا تاہم دینی اعتبار سے ان دونوں نظاموں میں کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کی حکومت ہے' خر آمد و گاؤ رفت یا گاؤ آمد و خر رفت۔ جب تک دین نہیں ہے' کفر کی جو بھی شکلیں ہوں' جو بھی ہیئتیں ہوں' ان سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا "الکفر ملۃ واحدۃ" یہ ملت واحدہ ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے حالات کے اعتبار سے مارشل لاء بہت مضر ہے یہ ایک صورت واقعہ ہے جس کو نہ میں بدل سکتا ہوں نہ آپ بدل سکتے ہیں۔ البتہ اگر ہمارے یہاں کوئی سمجھ دار حکومت آجائے تو تدریجاً اس کو بدل سکتی ہے بشرطیکہ وہ قیادت واقعی قومی سوچ رکھنے والی ہو' جس میں کوئی دور اندیشی بھی ہو اور بصیرت ہو۔

اب تک جو صورت حال تبدیل کر دی جانی چاہیے تھی' وہ یہ ہے کہ ہماری فوج صرف دو صوبوں سے ہے۔ بلکہ دو صوبے کہنا بھی غلط ہے کیونکہ اگر کبھی سرائیکی صوبہ بن گیا تو وہ پنجاب کا آدھا رقبہ ہے اور وہاں سے فوج میں کوئی بھرتی نہیں۔ فوج کی ساری بھرتی شمالی پنجاب سے ہے یعنی' گجرات' جہلم' راولپنڈی' کیمبل پور' میانوالی' اور سرگودھا یہ چند اضلاع ہیں جو پنجاب کا شمالی حصہ ہیں اور یہیں سے فوج کی بھرتی ہے یا پھر سرحد سے ہے۔ گویا ہمارے ملک میں اس اعتبار سے علاقائی تقسیم ہے کہ فوج کا تعلق صرف ان دو علاقوں سے ہے۔ جب فوج کی حکومت آتی ہے تو بقیہ علاقوں میں ایک محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا ردعمل پیدا ہوتا ہے

یہی رد عمل تھا جس سے ملک اور اسلام کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا۔ مشرقی پاکستان میں ایک لسانی تحریک بنگلہ بھاشا کے نام پر اٹھی' اس نے بنگلہ نیشنلزم کی شکل اختیار کی لیکن اسے تقویت ایوب خان کے مارشل لاء نے پہنچائی کہ حکومت فوج کی ہے اور فوج میں مشرقی پاکستان کا کوئی آدمی نہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی پاکستان دوسرے بازو پر حکومت کر رہا ہے۔ پھر بجٹ کا اکثر و بیشتر حصہ فوج پر خرچ ہوتا ہے۔ گویا کماتے ہم ہیں کھاتے وہ ہیں۔ یہ ایسے معاملات اور حقائق تھے کہ ان کا کوئی کیا جواب دیتا۔ فوج کی حکومت کی شکل میں ہمارے ہاں یہی صورت پیدا ہوتی ہے۔

یہی بات میں نے ۱۹۸۲ء میں نے اس خط میں کہی تھی جو ضیاء الحق صاحب کو لکھا۔ اس سے پہلے ان کی شوریٰ میں کھڑے ہو کر کہا کہ یہ مارشل لاء خطرناک ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ایک نجی ملاقات میں بھی ان سے جو بات کہی وہ یہی تھی کہ مارشل لا کا تسلسل اور دوام ملک کے لئے خود کشی کے مترادف ہے' آپ جلد از جلد اس ملک میں مروجہ سیاسی عمل کو شروع کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ یہ میری مستقل رائے ہے لہٰذا اس موقع پر میں نے عرض کر دی اور آج بھی میں اسی موقف پر قائم ہوں اگرچہ یہ بات میرے بہت سے رفقاء کی سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ تنظیم اسلامی جمہوریت کی تائید کیوں کرتی ہے جبکہ موجودہ جمہوریت کفر ہے۔ یہ بات اپنے ساتھیوں کو سمجھانے میں مجھے بڑی مشکل ہوئی ہے کہ آپ حالات سے منقطع نہیں رہ سکتے۔ اگر ہمارے پاس دو میں سے ہی ایک پر صاد کہنے کا اختیار ہو کہ یا تو یہ جمہوری عمل جاری رہے یا پھر مارشل لاء ہو تو اس میں سے ہم ملکی سلامتی کے لئے جس کو زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں وہ مارشل لاء ہے۔

کفر ہونے کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں' وہ سیکولر جمہوریت ہو یا سیکولر مارشل لاء لیکن فی الوقت سوال یہ ہے کہ اس ملک کی سالمیت کے لئے کیا ہونا چاہیے۔ یہ ملک اگر باقی رہے تب ہی کوئی کوشش اور محنت ہو سکتی ہے کہ یہاں پر اسلام کا نظام اور نظام خلافت قائم ہو۔ اس اعتبار سے مارشل لاء مضر ہے' خطرناک ہے جبکہ دوسرا نظام اس سے بہتر ہے کہ اس کی خرابیاں اپنی جگہ لیکن اس میں ملک کے باقی رہنے کی زیادہ توقع ہے۔

موجودہ حکومت کے بارے میں بھی دو باتیں تو ہم کہتے رہے ہیں' اب ان میں تیسری بات کا اضافہ

موجودہ حکومت کا مینڈیٹ مشکوک تھا' پھر ختم ہوا اور اب تو یہ اپنا جواز بالکل ہی کھو چکی ہے۔ اس کی دو وجوہ پہلے سے موجود تھیں' تیسری کا اضافہ پی ڈی اے کے نام نہاد لانگ مارچ پر سرکار کے غیر دستوری اور غیر قانونی رد عمل کی شدت نے کر دیا ہے۔

ہوا ہے۔ پہلی بات یہ کہ موجودہ حکومت جن انتخابات کے ذریعے قائم ہوئی وہ مروجہ مسلمہ اعتبارات سے معیاری نہیں تھے۔ اس لئے کہ ان کے بارے میں کچھ حقائق بہت واضح ہیں جو بھی نگران حکومتیں بنائی گئیں ان میں ایک خاص سیاسی جماعت کے کٹر دشمنوں کو بٹھا دیا گیا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے ہاں اس کے اثرات کا ہونا دو اور دو چار کی طرح بالکل طے شدہ ہے۔ ان نگران حکومتوں نے پوری حکومتی مشینری کا استعمال اپنے حق میں کیا۔ اب تو سوال یہ ہے کہ حکومتی مشینری کس حد تک استعمال ہوئی۔ اگر آپ نے گورنروں کی حیثیت سے عدلیہ کے لوگوں کو بٹھایا ہوتا' وہ لوگ لائے جاتے جو خود سیاست میں نہیں ہیں یا جن کے کسی سیاسی جماعت کے حق میں یا خلاف منفی یا مثبت رجحانات نہیں اور کسی بھی سیاسی جماعت کے ساتھ جن کو نفرت یا دشمنی نہ ہو اور ایسے لوگوں کی عارضی اور عبوری حکومت ہوتی اور ان کی نگرانی میں انتخابات ہوتے تو وہ صحیح ہوتے۔ پھر وہ نہ صرف بالفعل غیر جانبدارانہ ہوتے بلکہ نظر بھی غیر جانبدارانہ آتے جیسے آپ کہتے ہیں کہ

Justic should not only be done, it should also appear to have been done.

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مروجہ معیارات کے لحاظ سے اس حکومت کا مینڈیٹ صحیح ہے۔ پھر ایک اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھا رہا ہے جو صاحب اس وقت نگران وزیر اعظم تھے وہ برملا کہہ رہے ہیں کہ ان انتخابات میں (دھاندلی) ہوئی اور بہت غلط انداز میں ہوئی تھی۔ وہ خود معافی مانگ رہے ہیں کہ میں بھی چونکہ اس میں شریک رہا ہوں لہٰذا مجرم ہوں اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس مینڈیٹ کی حیثیت کم ہوئی پھر Mid night Jackals کی کہانی منظر عام پر آئی اور جس کی اب تک کوئی نفی نہیں کی گئی اس کے بارے میں بھی کہا تو صرف یہ گیا ہے کہ یہ معاملہ پہلے کیوں نہیں سامنے لایا گیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ کوئی دیوانی مقدمہ تو نہیں ہے کہ چونکہ اتنے سال گزر گئے ہیں لہٰذا آپ کو کوئی دعویٰ دائر کرنے کا حق حاصل نہیں رہا یہ قومی معاملات ہیں آج بھی اگر وہ کہانی درست ہے تو اس سے الیکشن کی Credibility اور مینڈیٹ کی حیثیت بہرحال مجروح ہوئی ہے۔

اس پر مستزاد جو بات سامنے آئی اور جس کی اب تک تردید نہیں کی گئی' یہ ہے کہ آئی جے آئی بنوائی ہی آئی ایس آئی نے تھی۔ یہ تو صرف ایس اور جے کا فرق تھا۔ فوج کے خفیہ ادارے کے دباؤ کے ساتھ آئی جے آئی بنوائی گئی اور پوری محنت کر کے بنوائی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس میں اہل سیاست کا نہیں بلکہ ہمارے خفیہ اداروں کا عمل دخل تھا۔ ان سب چیزوں کی بنا پر اس حکومت کا مینڈیٹ جمہوری عمل کے مروجہ اور مسلمہ سیاسی معیارات کے اعتبار سے شروع ہی سے مشکوک ہے اور "مشکوک" اس کے لئے ہلکے سے ہلکا لفظ ہے۔ ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ مینڈیٹ قوی ہے جیسا کہ انتخابات کے نتائج کی مناسبت سے اسے ہونا چاہیے تھا تو دوسری بات یہ ہے کہ جتنے کچھ بھی ووٹ انہوں نے لئے وہ اسلام کے نام پر لئے' آئی جے آئی کے جھنڈے تلے لئے تھے لیکن اس اسلام کا جو انہوں نے حشر کیا اور خاص طور پر نام نہاد نفاذ شریعت ایکٹ کے ذریعے جو معاملہ شریعت اسلامی کے ساتھ کیا' وہ ناقابل معافی ہے۔ پھر انہوں نے سود کے بارے میں فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کو چیلنج کیا۔ کورٹ نے بنک کے سود کو بھی ربو قرار دیا کھلم کھلا قرار دیا اور جو بھی اس

> پی ڈی اے کا لانگ مارچ ایک جوا ہے جو بے نظیر نے سادگی میں یا کسی "بالائی" اشارے پر کھیلا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت منفرد ہے کہ پچھلی سب سیاسی تحریکوں کے برعکس یہ کسی بھی دینی مذہبی جماعت کے اشتراک عمل کے بغیر خالص سیکولر عناصر کی چلائی ہوئی اور اس اعتبار سے شناختی کارڈ پر مذہب کے اندراج کے خلاف احتجاج کا تسلسل ہے۔

دور میں عدل کے تقاضے ہو سکتے ہیں ان سب کو پورا کر کے یہ کام کیا۔ یعنی جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ ہمیں شکایت تھی کہ فیڈرل شریعت کورٹ اس معاملے کو کیوں لمبا کھینچ رہی ہے اور کیوں اس کی سماعت جلدی نہیں کر رہی۔ جو بھی مخالف لوگ یہ رائے رکھنے والے تھے کہ بنک کا سود ربو نہیں ان کو عدالت نے پورا موقع دیا کہ دلائل لائیں اور کتاب و سنت سے ثابت کریں، کسی اور حوالے سے یا عقل اور نقل سے ثابت کریں۔ قادیانیوں کو اس ملک میں غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ بھی ایسے ہی ہوا تھا کہ جو بھی مروجہ اور مسلمہ معیارات ہو سکتے ہیں، ان سب کے تقاضوں کو پورا کر کے کیا گیا تھا۔ اسمبلی میں معاملہ آیا اور یہ چند علماء کے فتووں کا معاملہ نہیں رہا تھا۔ پھر اسمبلی کی کمیٹی نے لاہوری اور ربوائی قادیانیوں کو پورا موقعہ دیا کہ آئیں اور اپنا موقف بیان کریں اور وہاں جب انہوں نے خود مان لیا کہ ہم غلام احمد کو نبی مانتے ہیں تو اس کے بعد کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ دنیا میں حقوق انسانی کے نام پر یہ دہائی تو دی جاتی ہے کہ یہ مذہبی امتیاز ہے لیکن کسی نے آج تک اس Process کی Credibility پر انگلی نہیں رکھی کہ یہاں یہ کمی یا کوتاہی ہوئی یا قانون کے تقاضے پورے نہیں کئے گئے کیونکہ پوری طرح انصاف ہوا تھا۔

اسی طرح فیڈرل شریعت کورٹ نے اس معاملے میں عدل کا جو بھی تقاضا ہو سکتا ہے، پورا کیا اور اس کے بعد فیصلہ دیا تھا۔ پہلے یہ کہتے رہے کہ ہم مہلت کے اندر اندر کوئی متبادل تلاش کر لیں گے اور اپیل میں نہیں جائیں گے لیکن بالآخر اپیل میں جا کر اس کو چیلنج کر دیا۔ چنانچہ میرے نزدیک وہ مینڈیٹ جو شروع سے مشکوک تھا، دینی اور اخلاقی اعتبار سے بھی صفر ہو چکا ہے اور اس کا کوئی وجود نہیں رہا۔ اگر کچھ تھا بھی تو سب مذہبی پارٹیوں کے آئی جے آئی سے علیحدہ ہونے پر ختم ہو گیا۔ جماعت اسلامی علیحدہ ہو چکی، جے یو آئی علیحدہ ہو چکی اور اب تک لگی ہوئی اگر کوئی ہے تو وہ چھوٹی سی جمعیت اہل حدیث ہے جس کی ملکی سیاست کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں ایک فرقہ تو وہ ضرور ہے لیکن سیاسی اعتبار سے اس کی حیثیت کیا ہے۔ تاہم جمعیت اہل حدیث بھی دھمکی تو دے ہی چکی ہے کہ ہم بھی فیصلہ کر رہے ہیں، تین مہینے کی مہلت دے رہے ہیں کہ اسے نوٹس سمجھا جائے حالانکہ اس قسم کا نوٹس تو وہاں دیا جاتا ہے جہاں بات واضح نہ ہو۔ جب بات اس حد تک واضح ہو گئی تو پھر کاہے کا نوٹس، تو یہ اصل میں سیاست ہے اور جب مذہب کے نام پر اتنی گندی سیاست کی جاتی ہے تو اس پر زیادہ دکھ ہوتا ہے۔ سیکولر لوگ ایسی گندی سیاست کریں تو کوئی دکھ نہیں ہوتا جبکہ یہ لوگ مذہب کے نام پر یہ حرکت کر رہے ہیں۔ گویا ابھی انہیں اس حکومت سے کوئی امید ہے جبکہ وہ سود کے بارے میں فیصلے پر اپیل دائر کر چکی ہے۔ یہ دوسری حقیقت ہے کہ موجودہ حکومت سیاسی اور مذہبی اعتبار سے بھی اپنا جواز کھو چکی ہے۔

اب تیسرا مرحلہ آگیا اور اس کے تقاضے بھی پورے ہو گئے کہ کوئی سیاسی اور دستوری Credibilty سرے سے باقی نہیں رہی۔ میرے بیان کا یہ حصہ چونکہ اخبار میں چھپا نہیں اس لئے میں اس پر زیادہ زور دے رہا ہوں کہ کسی بھی سیاسی ایجی ٹیشن کو جب تک اس کی طرف سے توڑ پھوڑ نہ ہو، آپ at Source بند کرنے کی کوشش کریں تو دستور کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ بے نظیر کو آپ گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دے رہے ہوں اور وہ وہاں سے نکلی ہو تو عینک تڑوا کر اور ڈنڈے کھا کر تو آپ نے سارے معیارات کو خاک میں ملا دیا۔ ہاں جلوس نکلتا اور وہ کہیں توڑ پھوڑ کرتا تو پھر آپ جو کرتے، اس کے لئے آپ کے پاس جواز تھا لیکن جس طریقے سے پورے ملک کو منجمد کیا گیا پورا ٹریفک روک دیا گیا، پٹرول پمپ تک بند کئے گئے، دو دو ڈھائی ڈھائی سو بسیں پکڑ کر بند کر دی گئیں۔ ٹریفک جام کر دیا گیا اور اس کے باوجود اگر کچھ لوگ نکل آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ ہمیں تو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ خالص سیکولر مقاصد کے لئے لوگ ایسی قربانیاں دے رہے ہیں، ماریں کھائی ہیں، لیڈروں نے بھی مار کھائی ہے، چوٹیں سہیں، وہ زخمی ہوئے اور ان کے کپڑے بھی پھٹے ہیں، سب کچھ ہوا ہے۔ یہ سب کچھ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مطمع نظر خالص سیکولر ہے۔ ان کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ مذہب اگر ہے بھی تو وہ عرسوں والا یا مزاروں والا یا تعزیوں والا ہو تو ہو۔ حقیقت میں جو دین کے تصورات ہیں ان سب سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ اب تو وہ کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ شناختی کارڈ کے مسئلہ پر ان کا موقف سامنے آچکا ہے اور ثابت ہو گیا کہ ان کا ذہن خالص سیکولر ہے۔

بے نظیر تو یہ تک کہہ چکی ہے کہ ہم جداگانہ انتخابات کو بھی غلط سمجھتے ہیں، انتخابات ہی مخلوط ہونے چاہئیں۔ اس اعتبار سے یہ لوگ اس ملک کے مذہبی پس منظر کی بھی نفی کر رہے ہیں اور وہ کھلم کھلا کر رہے ہیں لہٰذا ہمارے لئے ان کا معاملہ اس اعتبار سے عبرت آموز ہے کہ وہ لوگ اپنے ان سیکولر نظریات کے لئے یا آپ یہ کہہ لیں کہ حکومت حاصل کرنے کے لئے اگر اتنی قربانیاں دے رہے ہیں تو سوچنا چاہیے کہ دین کے جو متوالے اور نام لیوا ہیں، اور دین کے لئے زبانی جمع و خرچ کرنے والے ہیں، ان میں سے کتنے یہ قربانی دینے کے لئے، مشقت جھیلنے کے لئے اور مصائب و اذیت کرنے کے لئے

چار ہیں؟ یہ الرچہ ہمارے لئے اس اعتبار سے لمحہ فکریہ ہے تاہم میرے نزدیک اب اس کے بعد موجودہ حکومت کا سیاسی اور دستوری جواز بھی ختم ہو چکا ہے جو کچھ پرسوں (۱۸ر نومبر کو) ہوا یہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ یوں تو ہوا ہے کہ جلوس نکل رہے ہوں تو ان کو منتشر کرنے کے لئے کسی قانون شکن مجمع پر تشدد کیا گیا ہو اور یہ بالکل دوسری بات ہے لیکن یہاں جو صورت اختیار کی گئی کہ پورا ملک پہلے سے ہی بد ترین قسم کی پولیس سٹیٹ بنا دیا گیا اور سارا معاملہ پولیس کے ہاتھ میں تھا کہ وہ جیسے چاہے کنٹرول کرے تو اس صورت حال میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اب حکومت کا دستوری اور قانونی جواز بھی ختم ہوگیا۔ ہمارا موقف پہلے سے یہ تھا اور کئی مرتبہ میں اسی منبر سے بھی بیان کرچکا ہوں کہ نیا انتخاب ہونا چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ نیا الیکشن ہونا چاہیے بلکہ وہ خالص غیرجانبدارانہ ہو اور نظر بھی آئے کہ غیرجانبدارانہ ہے' ایک غیر جانبدار حکومت کے تحت ہو۔ مروجہ اور مسلمہ معیارات کے مطابق سیاسی عمل اگر یہاں چلنے نہیں دیا گیا تو اس ملک کے ٹکڑے ہوجائیں گے یہ ختم ہوجائے گا

یہ ہے وہ تیسری بات جس کا اب اضافہ ہوا ہے ورنہ ہمارا مستقل تو یہ موقف رہا ہے کہ اس حکومت کا مینڈیٹ صاف نہیں ہے۔ یہ بات پچھلے پورے دو سال کے دوران میں نے بار بار کہی ہے۔ جب فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ آیا اور اس کی مخالفت کی گئی کہ سردار آصف احمد علی آخر حکومت ہی کے نمائندے ہیں' تب میں نے یہی بات کہی کہ اس حکومت کا دینی اور مذہبی جواز بھی ختم ہوچکا ہے۔ اس کا اخلاقی جواز ختم ہوچکا۔ یہ اسلام اور آئی جے آئی کے نام پر آئے تھے۔ آئی جے آئی ختم ہوچکی اور جو کارنامہ انہوں نے انجام دیا ہے کہ خود نفاذ شریعت ایکٹ میں سودی معیشت کو برقرار رکھنے کا اعلان کیا جارہا ہے تو یہ گویا ڈھٹائی کی انتہا ہے۔ ایک ہے کسی برائی میں آدمی کا ملوث ہونا' ایک ہے علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ کوئی غلط کام کرنا اور پھر اس پر شریعت کا لیبل چسپاں کرنا تو یہ ڈھٹائی اور بے حیائی کی انتہا ہے اور اس کے بعد ان کا اگر کوئی مذہبی یا اخلاقی جواز تھا تو وہ بھی ختم ہوچکا ہے۔ اب جیسا کہ میں نے عرض کیا' تیسری بات یہ ہے کہ کوئی قانونی اور سیاسی جواز بھی باقی نہیں رہا۔ سیاسی اور دستوری جواز ختم ہوگیا آپ نے دستور کے دئے ہوئے حقوق کو سلب کیا ہے۔ لوگوں کا حق ہے کہ جلسہ کریں' جلوس

آئی جے آئی کی حکومت کی بے تدبیری سے یہ تحریک خون خرابے میں بدلتی نظر آتی ہے جس کے دونوں نتائج ہولناک ہوں گے۔ مارشل لاء آیا تو وہ بھی ملک و قوم کے حق میں سم قاتل ہے اور بات بڑھی تو ایک خالص سیکولر انقلاب آئے گا جو اس ملک کے جواز ہی کو ختم کردے گا چنانچہ واحد چارۂ کار یہ ہے کہ صدر مملکت ایک خالص غیرسیاسی اور غیرجانبدار نگران حکومت کے تحت نئے منصفانہ انتخابات کے لئے فوراً ضروری قدم اٹھائیں۔

نکالیں اور سیاسی ایجی ٹیشن کریں اور آپ کو ان کے خلاف کارروائی کا صرف اس صورت میں حق ہے کہ وہ توڑ پھوڑ کریں لیکن یہاں تو اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ کسی پارٹی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوتا کہ جلوس تو ہم نے نکالا تھا توڑ پھوڑ کوئی اور کرگیا۔ توڑ پھوڑ کی ذمہ داری اس پارٹی کو لینی چاہیے جو لوگوں کو سڑکوں پر لاتی ہے۔ لیکن یہاں تو وہ پوزیشن ہی نہیں آنے دی گئی بلکہ جلوس کو بننے ہی سے روکا گیا ہے جو ایک انتہا ہے۔ مروجہ اصول اور مروجہ معیارات اور مسلمہ اصول اور مسلمہ معیارات کی کامل نفی ہوچکی ہے اور اسی لئے ہمارا موقف اب یہ ہے کہ جتنی جلدی ہوسکے صدر مملکت ان اسمبلیوں کو توڑ دیں اور نئے انتخابات کرائیں۔ اس پر بھی ہم کوئی مہم چلانے کا ارادہ نہیں رکھتے' اپنا موقف بیان کردیا اور اس کے علاوہ اللہ سے دعا ہی کرسکتے ہیں کہ انہیں توفیق دے کہ وہ اپنے بڑھاپے کی طرف بھی نظر کریں' ان کی قبر منہ کھولے ہوئے منتظر ہے' اس کے بارے میں اور کچھ اس ملک کی خیریت کے بارے میں سوچیں اور خالص غیر جانبدارانہ انتخابات یہاں پر کرانے کا انتظام کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو اب دو امکانات ہیں' ایک امکان تو یہی کہ پھر مارشل لاء آجائے اور بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے۔ واللہ اعلم میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا یہ زبان خلق پر ہے۔ شاید کوئی اس طرح کی مفاہمت بھی ہو کیونکہ بعض باخبر صحافی جو لیفٹ کی طرف رجحان رکھتے اور پروپی پی ہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ بے نظیر کی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہے۔ الا یہ کہ یہ کسی وسیع تر سکیم کا حصہ ہو۔

اگر یہ کسی اور کے اشارے پر ہے' کوئی اور سکیم پس پردہ ہے تو اللہ ہی جانے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ نہیں ہے۔ لا نصدق ولا نکذب۔ لیکن بہرحال یہ مسئلہ ہے تو ایک امکان موجود ضرور ہے اور اس کا جواز بھی پیدا ہو جائے گا کہ اگر حکومت ایجی ٹیشن کو کنٹرول نہیں کرپاتی تو فوج ملک کی سلامتی کے نام پر قدم اٹھائے اور مارشل لاء لگادے۔ اس جواز کی بنیاد پر پہلے بھی تو مارشل لا لگتے رہے ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں' یہ اس ملک کے لئے خود کشی کے مترادف ہوگا۔

میرے نزدیک سیکولر جمہوریت ہو یا سیکولر مارشل لاء ہو یا ملوکیت ہو' دینی اعتبار سے کوئی فرق نہیں لیکن اس ملک کے اعتبار سے جو ہماری معروضی حالت ہے اس کے اعتبار سے زیادہ خطرناک شے مارشل لاء ہے۔ اب دوسرا امکان کیا ہے؟ یہ وہ بات ہے جس کی طرف میں خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اگر صدر غلام اسحاق خان صاحب فوری طور پر کوئی قدم نہیں اٹھاتے' اسمبلیوں کو ختم نہیں کرتے' نئے انتخابات نہیں کرواتے اور ایجی ٹیشن بھی چلتا ہے تو دنیا میں جو اصول ہے وہی ہو گا کہ ایجی ٹیشن کو جتنا یہ دبائیں گے' اتنا ہی ابھرے گا' اس صورت

یہ احتجاجی تحریک جبر و تشدد سے دبنے کی بجائے ابھرے گی اور اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں سیکولرزم کو پورا غلبہ حاصل ہو جائے لیکن اس شر میں سے بھی ایک خیر برآمد ہو سکتا ہے!

میں جو سب سے زیادہ خوفناک نتیجہ نکلے گا' اس کی طرف شاید بہت سے لوگوں کا ذہن بالکل نہیں گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس ملک میں یہ پہلا ایجی ٹیشن ہو گا جو خالص سیکولر بنیادوں پر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے جتنے بھی ایجی ٹیشن ہوئے' ان میں مذہبی جماعتیں بھی لپٹی ہوئی ہوتی تھیں اور مذہب کا کوئی نہ کوئی عنوان بھی ہوتا تھا۔ ایوب خان کے خلاف ایجی ٹیشن ہوا' اس میں بھی مذہب کا عنصر تھا۔ جماعت اسلامی پیش پیش تھی اور جمعیت علمائے اسلام موجود تھی' سب موجود تھے۔ اس کے بعد بھٹو کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوئی وہ تو ہوتے ہوتے نظام مصطفےٰ تحریک ہی بن گئی۔ اس میں تمام مذہبی جماعتیں موجود تھیں اگرچہ وہ بھی خالص سیاسی تحریک تھی۔ یہ بات میں نے اس وقت بھی ڈنکے کی چوٹ کہی تھی کہ خالص سیاسی تحریک ہے اور اس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس کی وجہ سے مسجد خضراء سے میرے درس اور خطاب جمعہ کا سلسلہ منقطع ہوا۔ اس وقت جو فضا بن گئی تھی تو "نظام مصطفےٰ تحریک" کے بارے میں کوئی یہ بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ میں نے جو بات درست سمجھی اسے کسی خوف یا لالچ سے کوئی اثر لئے بغیر ڈنکے کی چوٹ کہا۔ ہم رائے عامہ یا کسی اور دباؤ کے تحت اپنے موقف کو نہیں بدل سکتے۔ موقف بدلیں گے تو دلیل سے۔

بہرحال کہنا یہ کہ یہ جو دونوں ایجی ٹیشن تھے' ان میں مذہبی جماعتیں بھی تھیں لہٰذا جو نتائج نکلنے چاہئیں تھے وہ پوری طرح مذہب کے حق میں نہیں آئے لیکن خالص سیکولرزم کی طرف بھی نہیں جا سکے۔ اس اعتبار سے ہماری قومی' ملکی اور سیاسی زندگی کا یہ مرحلہ بہت اہم ہے' اس کو سمجھنا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ یہ سابقہ مراحل سے مختلف ہے۔ یہ ایجی ٹیشن اگر پروان چڑھ گیا تو یہ خالص سیکولر ہو گا کیونکہ کوئی مذہبی جماعت اس میں شامل نہیں ہے۔ تحریک فقہ جعفریہ کو مذہبی جماعت شمار کرنے والوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ بھی پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا پسند کریں گے کیونکہ اقلیت میں ہونے کے باعث یہاں اکثریت کا مذہب ان کو پسند نہیں گویا درحقیقت اس میں کوئی مذہبی جماعت شامل نہیں بلکہ جیسا میں نے سمجھا ہے اس بات کو نوٹ کیجئے کہ مذہبی سیاسی جماعتیں اس وقت بالکل تنہا رہ گئی ہیں' irrelavant ہو چکی ہیں' انکی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ اپنے دل کو بہلانے کے لئے ان کی طرف سے کچھ بیان آئے ہیں۔ جمعیت علماء اسلام کا بیان تھا کہ ہم اس ایجی ٹیشن میں ساتھ نہیں ہیں لیکن پھر جب ہم میدان میں نکلیں گے تو ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم آئیں گے تو اصل لانگ مارچ ہو گا۔ اسی طرح کنی صاحب نے جو "پاسبان" کے تھے یا جماعت اسلامی کے' انہوں نے چند دن پہلے کہا کہ قاضی صاحب آئیں گے تو اصل لانگ مارچ ان کی قیادت میں ہو گا۔

مذہبی جماعتوں کی یہ باتیں اپنی جگہ' کیونکہ ہر جماعت کو ضرورت ہوتی ہے اپنے کارکنوں کا مورال اونچا کرنے اور انہیں کچھ نہ کچھ دلاسہ دینے کی لیکن جو تلخ حقیقتیں ہیں انہیں تسلیم کر لیجئے۔ یہ ایجی ٹیشن جو پرسوں سے شروع ہوا ہے' خالص سیکولر ہے۔ اس کی پشت پر غیر مسلم اقلیتیں بھی ہیں' اس کی پشت پر قادیانی ذہن بھی ہے' اس کا سرمایہ بھی ہے اور جو کچھ بھی شناختی کارڈ کے مسئلے پر ہو چکا ہے اس کے ساتھ ملحق ہو کر یہ ایک خطرناک مسئلہ بن گیا ہے۔ اس میں مذہبی جماعت اگر کوئی ہے تو وہ صرف تحریک نفاذ فقہ جعفریہ ہے لیکن یہاں چونکہ وہ اقلیت میں ہیں لہٰذا اقلیتوں کیلئے تو سیکولرزم ہی مناسب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہندوستان میں سیکولرزم کے علمبردار ہیں اگرچہ میرے نزدیک یہ منافقت ہے۔ میں نے وہاں کے دینی رہنماؤں کے لئے یہ سخت لفظ استعمال کیا کہ آپ واہگے کے اس پار تو کہتے ہیں کہ سیکولرزم ہونا چاہئے اور واہگے کے اس پار آپ کہتے ہیں کہ سیکولرزم کفر ہے۔ یہ تو منافقت ہے۔ اصول ایک ہونا چاہئے۔ جیسے یہ معاملہ کہ پاکستان بننے سے پہلے ہماری قومیت کی بنیاد مذہب تھی اور پاکستان بننے کے بعد اس کی بنیاد وطن بن گیا ہے تو یہ تضاد ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن حقائق تو حقائق رہیں گے۔ کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے تو بلی معدوم نہیں ہو جاتی۔ غالباً اگست یا ستمبر کے مہینے میں میں نے تقریریں کی تھیں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان اس وقت فیصلہ کن طور پر بنیاد پرستی (Fundamentalism) اور سیکولرزم کے دوراہے پر آچکا ہے۔ یہ بات میں نے "نوائے وقت" میں بھی لکھی تھی کہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں علی الاعلان بنیاد پرستی کو ترک کر کے سیکولرزم اختیار کر لیا جائے گا۔ جیسے ترکی علی الاعلان سیکولر ہے حالانکہ ان کے ہاں مسلمان آبادی کا تناسب ہمارے یہاں سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود وہ ملک کھلم کھلا سیکولر ہے' وہاں اسلام کے نام پر کوئی پارٹی بھی وجود میں نہیں آسکتی۔ لہٰذا جو مذہبی جماعت وہاں ہے اس نے بھی اپنا نام "نجات ملی پارٹی" رکھا ہوا ہے۔ اسلامی کا نام وہ نہیں لا سکتے۔ یہاں تک طے ہے کہ کوئی اسمبلی صد فی صد ووٹوں سے بھی ان تین دفعات کو نہیں بدل سکتی جو ترکی کو ایک سیکولر جمہوریہ قرار دیتی ہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ اگر معاملہ یونہی چلا تو اس کے نتیجے میں یہاں بھی سیکولرزم آجائے گا۔ اس وقت نوٹ کیجئے کہ ایک مخمصہ درپیش ہے' مذہبی جماعتیں کیا کریں گی؟ ایجی ٹیشن کا ساتھ دیتی ہیں تو سیکولرزم کو تقویت حاصل ہوتی ہے' حکومت کا ساتھ دیتی ہیں تو پھر حکومت کی منافقت میں بھی شریک ہوتی ہیں۔ منافقت تو کھلی ہے' کیا کریں! گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ اس وقت وہ صرف اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہیں۔ قاضی صاحب آئیں گے تو اصل لانگ مارچ ہو گا' اور جب ہم لوگ مارچ کریں گے تو اصل لانگ مارچ ہو گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ معروضی مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اس وقت ملکی صورت حال دین کے اعتبار سے بہت گھمبیر ہو چکی ہے۔

اس صورت حال میں مشورے کیا ہیں؟۔ میرا سب سے پہلا اور فوری مشورہ تو یہ ہے کہ جن کو بھی

کوئی بات کہنے کا موقعہ حاصل ہے یا صدر مملکت پر اثر انداز ہونے اور انہیں صحیح بات سمجھانے کا کوئی ذریعہ میسر ہے انہیں چاہیے کہ صدر صاحب پر دباؤ ڈالیں کہ وہ فوری طور پر اور اس سے پہلے پہلے کہ لانگ مارچ واقعتاً ایک تحریک کی شکل اختیار کرلے ' اسمبلیوں کو برخاست کردیں اور تازہ انتخابات کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ دوسری بات یہ کہ اب وہ پہلی غلطی نہ دوہرائیں۔ خدا کے لئے اپنی عمر کو بھی دیکھیں ' قبر کو یاد کریں ' اس ملک کے مستقبل کا خیال کریں اور اس قوم کا خیال کریں۔ مجھے نعیم صدیقی صاحب کا شعر یاد آرہا ہے جو انہوں نے اس تحریک کے لئے کہا تھا جس میں ہم بھی شامل تھے اور نعیم صدیقی صاحب اس کے نمائندہ شاعر کی حیثیت میں تھے۔

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

یہ پاکستان ہمارے لئے امید کا ایک چراغ ہے نہ معلوم کتنے لوگوں کا خون ہے جو اس کے دیئے میں جل رہا ہے ' کتنی مسلمان خواتین کی عصمتیں اس ملک کے نام پر لٹیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ملک جو دنیا کے مسلمان ممالک میں آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا تھا اور آج بھی دنیا کے عظیم ترین مسلم ملکوں میں جس کا شمار ہوتا ہے ' اسلام کے نام پر بنا تھا

صدر صاحب ماضی کی اس تاریخ اور ملک کے حال کا کچھ خیال کریں اور ایک مرتبہ ایسے انتخابات کرادیں جو نمایاں طور پر نظر آئیں کہ غیر جانبدارانہ ہیں اس لئے کہ جب تک یہاں اسلامی انقلاب نہیں آتا ہمارے پاس کوئی اور Option ہے ہی نہیں ۔ یہی ایک Option ہے ورنہ پھر مارشل لاء ہوگا اور مارشل لاء کے بارے میں اپنی رائے بیان کرچکا ہوں ۔ یا پھر کیا یہاں مزید خون خرابہ کروانا ہے ؟ ۔ ہرچہ دانا کند ' کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار اور خون خرابہ زیادہ ہوتا ہے تو یہ اور بھی برا ہے۔ اس سے بھی زیادہ برا امکان یہ ہے کہ خالص سیکولر جماعتوں کی شروع کی ہوئی یہ ایجی ٹیشن اگر خدانخواستہ ایک تحریک بن کر کامیاب ہوجائے تو اس ملک سے کچھ عرصے کے لئے تو اسلام کا نام ختم ہوجائے گا ۔ اگرچہ اس کے بارے میں بھی میری ایک رائے ہے جو اس سے پہلے بھی ظاہر کی اور آج پھر واضح کردینا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک ایسا کوئی معاملہ ہوجائے اور یہ ملک قائم رہے تو اس شر کے اندر سے بھی خیر برآمد ہوسکتا ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ اس

تنظیم اسلامی تو اپنی توانائیاں اسلامی انقلاب کے لئے وقف کرچکی ہے البتہ وہی دینی مذہبی جماعتیں جو اب تک انتخابات کے ذریعے اسلام کی کسی خدمت کی امید رکھتی ہیں ' باہم متحد ہی ہوجائیں اور سیکولر جماعتوں سے اشتراک عمل نہ کریں۔

صورت میں یہاں کی مذہبی سیاسی جماعتیں اپنی پوری حکمت عملی پر نظرثانی کرنے کے لئے تیار ہوں جس پر ابھی تک وہ آمادہ نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جھٹکا کھانے کے بعد اور ایک مرتبہ میدان سے نکال دئے جانے کے بعد اپنے صغریٰ کبریٰ پر دوبارہ غور کریں اور صحیح راستے پر آجائیں ۔ بہرحال زیادہ دیر نہ لگائی جائے اور صدر مملکت اپنا دستوری حق اختیار کرتے ہوئے ان اسمبلیوں کو بھی برخواست کریں جیسے کہ انہوں نے پہلے کی تھیں اور تین مہینے کے اندر ایک ایسی حکومت کی نگرانی میں جو بالکل غیر جانبدار ہو اور جس میں عدلیہ کے لوگ ہوں ' نئے انتخابات کروائیں

دوسرا مشورہ اس بنیاد پر ہے کہ جو مذہبی جماعتیں اب بھی اس موقف پر قائم رہیں کہ الیکشن میں حصہ لے کر وہ اسلام کی کوئی خدمت کرسکتی ہیں ' وہ سخت مغالطے میں ہیں۔ اس حقیقت کو مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اسلامی انقلاب الیکشن کے ذریعے سے نہیں آسکتا لیکن وہ پختون پٹی میں اپنے سیاسی اثر رسوخ کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کو کیسے سمجھایا جائے۔ تاہم ان جماعتوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ کسی سیکولر جماعت سے کوئی معاملہ نہ کریں۔ میں نے ۶ر نومبر کے خطاب جمعہ میں قاضی حسین احمد صاحب کی تعریف کی تھی کہ الحمدللہ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ الیکشن کے ذریعے اسلام نہیں آسکتا اور طاہر القادری صاحب کے بھی اسی طرح کے بیانات آئے ہیں اس بات پر بھی ان میں اتفاق نظر آتا ہے کہ جب تک جاگیرداری کا خاتمہ اور سرمایہ داری کی بیخ کنی نہیں ہوگی ' یہاں انتخابات کے ذریعے سے کوئی خیر ممکن نہیں ۔ اب اگر دونوں باتوں کے آپ قائل ہوچکے ہیں تو ایک ہی قدم اور اٹھانا رہ جاتا ہے کہ انتخابات کو تین طلاقیں دیجئے اور مزاحمتی تحریک کی بات کیجئے ۔ ورنہ کم از کم اس موقف پر تو قائم رہئے کہ کوئی مذہبی جماعت کسی سیکولر جماعت کے ساتھ اتحاد نہ کرے۔ یہ نہ ہو کہ جماعت اسلامی مسلم لیگ کے ساتھ آئی جے آئی میں تو آگئی لیکن اب کہا جارہا ہے کہ وہ تو سیکولر لوگ ہیں تو کیا آپ کو پہلے ان کے سیکولر نظریات معلوم نہیں تھے؟ اور جے یو آئی پیپلزپارٹی کے قریب پہنچ گئی تھی ۔ بے نظیر کے ساتھ صرف سرحد کی سیٹوں پر معاہدہ نہیں ہوسکا تھا باقی تو سارے کا سارا معاملہ طے ہوچکا تھا ۔ اسی طرح جے یو پی تحریک استقلال وغیرہ کے ساتھ تھی اب یہ نہ ہو کہ مختلف مذہبی جماعتیں سیکولر عناصر کے ساتھ اتحاد کرلیں اور اس کا بھی دوسرا جزو یہ ہے کہ آپس میں متحد ہوں ۔ میں نے جے یو آئی (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) اور جے یو پی (مولانا نورانی میاں گروپ) کے اتحاد کا خیر مقدم کیا ۔ اب کچھ عرصے سے اس اتحاد کی خبریں نہیں آرہی ہیں بلکہ کچھ نوجوان میرے پاس آئے تھے جو انجمن طلباء اسلام کے ورکر ہیں ' انہوں نے بتایا کہ اس اتحاد میں سب سے زیادہ فیصلہ کن رول مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ادا کیا تھا جو گوجرانوالہ کی معروف شخصیت ہیں ۔ وہ اس درجے مایوس ہوچکے ہیں کہ پاکستان چھوڑ کر چلے گئے اور جاکر انگلستان میں بیٹھ گئے ہیں ۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی نہیں لیکن اب بھی منڈھے چڑھ جائے تو میں خیر مقدم کروں گا۔ اس سے ایک امکان تو پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی جماعتوں میں انتخابی اتحاد ہوسکتا ہے ۔ اور ان دو جماعتوں میں تو ضرور ہونا چاہیے دونوں فقہ حنفی کے ماننے والے ہیں سوائے اس کے کہ کچھ شخصیتوں کا مناقشہ ہے ' مولانا احمد رضا خان بریلوی ' اور مولانا اشرف علی تھانوی کے درمیان اختلاف ہے ۔ ورنہ ان کے موقف تقریباً

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

یہ بات بے نظیر کو سجھائی کس نے!

لانگ مارچ... کیا کھویا' کیا پایا؟

عبدالکریم عابد

وہ موقع پرستوں کے جلو میں نمودار ہوئیں اور خوف زدہ حکومت حواس باختہ ہوگئی

سارے ملک کی ناکہ بندی' لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے استعمال کا نیا ریکارڈ

پاکستانی سیاست کا نیا عنوان لانگ مارچ ہے اور اس عنوان کے تحت حزب اقتدار اور حزب اختلاف نے ایک نیا مضمون رقم کیا ہے۔ حکومت فخریہ کہتی ہے کہ ہم نے لانگ مارچ کو ناکام بنا دیا لیکن کس طرح؟۔ جی ٹی روڈ کو سنسان کر دیا گیا' ملک میں جگہ جگہ پولیس ایکشن کیا گیا' دھڑا دھڑ گرفتاریاں کی گئیں' پشاور سے اور لاہور سے راولپنڈی تک پولیس ہی پولیس تھی' لیاقت باغ کو پانی کا تالاب بنا دیا گیا اور سڑک پر کسی آدمی کا چلنا ایک خطرہ مول لینا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ سو آدمی ہوں گے یا پانچ ہزار ہوں گے لیکن آدمیوں کی تعداد سے زیادہ پولیس کی نفری تھی جس نے لاٹھیاں برسانے اور اشک آور گیس کے گولے پھینکنے کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸ر نومبر کو لانگ مارچ کے سوا حکومت کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ حکام ہر طرف لانگ مارچ دیکھ رہے تھے۔ صنعت' تجارت اور صحت جیسے محکموں کے وزیر مشیر اور ان کے بغل بچے بھی دھڑا دھڑ اخباری بیانات جاری کرتے رہے۔ یہ بیانات بھی ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ چودھری شجاعت کی عجیب ہسٹریائی کیفیت تھی اور اس کیفیت میں انہیں ہزاروں مسلح تخریب کار نظر آئے جو پارلیمنٹ' ٹی وی' ایوان صدر اور بیرونی سفارتی مشنوں پر قبضے کیلئے بڑھے چلے آرہے تھے۔ اسی طرح کے ڈراؤنے خواب جاگتے میں دوسرے لوگوں کو بھی نظر آئے اور ساری حکومت خوف وہراس سے چیخنے چلانے لگی۔ اس بنا پر پیپلزپارٹی اور اس کے رہنما اب دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنی طاقت سے حکومت کو بے وقعت کر کے رکھ دیا' تمام معمول کی زندگی درہم برہم ہوگئی اور حکومت ایک انتظامی ادارہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اس کی حالت مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ ہمارا مارچ ہوا یا نہ ہوا لیکن حکومت کی خوب لیفٹ رائٹ ہوئی۔ ان کا کہنا بجا لیکن سوال یہ ہے کہ اس ساری کارروائی میں کس نے کیا کھویا اور کیا پایا؟۔ اور جب ہم اس نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی نے کھویا ہے اور پایا کسی نے کچھ نہیں۔ سب سے زیادہ ملک اور قوم نے کھویا ہے۔

حکومت کا نقصان یہ ہوا کہ وہ ملک میں اور ساری دنیا میں بدنام ہوگئی۔ اس حکومت کے حامیوں نے بھی ظاہر کیا کہ اس کارروائی کے بعد حکومت کی آنکھ کا پانی بالکل ہی مرجائے گا۔ وہ ڈھیٹ تو پہلے بھی تھی مگر اب پرلے درجے کی ڈھیٹ ہو جائے گی کیونکہ اس نے کھلم کھلا سیاسی بے حیائی کو اختیار کیا اور جو سیاسی لباس اس نے زیب تن کر رکھا تھا' وہ اتار پھینکا۔ اس نے ایک معمولی سے لانگ مارچ کو روکنے کیلئے ایسے ننگے پن کا مظاہرہ کیا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ حکومت کے خلاف جلسے جلوس نئی بات نہیں ہے' ہر حکومت کو ان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خان قیوم نے جلوس نکالا جو میلوں لانبا تھا اور صدر ضیاالحق کے زمانے میں بے نظیر صاحبہ کا فقید المثال جلوس نکلا۔ اس موقع پر جونیجو وزیراعظم تھے اور جلوس کے سلسلہ میں پیپلزپارٹی انتظامیہ سے اور انتظامیہ پیپلزپارٹی سے کامل تعاون کرتی رہی۔ کسی کی تکسیر بھی نہیں پھوٹی۔

ایسا اس موقع پر بھی ہو سکتا تھا اور انتظامیہ پیپلزپارٹی کو اپنی طاقت کے مظاہرہ کا کھلا موقع دیتی تو اسلام آباد میں چالیس پچاس ہزار سے زیادہ آدمی جمع نہیں ہو سکتے تھے اور اگر ایک لاکھ بھی جمع ہو جاتے تو کوئی ہرج نہیں تھا' بعد میں نواز شریف صاحب کیلئے کیا مشکل تھا کہ وہ دو لاکھ کا مجمع اکٹھا کر لیتے۔ پی این اے کی تحریک کے زمانے میں کراچی نے اصغر خاں کا جلوس دیکھا جس میں لوگوں کا سمندر رواں تھا' اس کے جواب میں پیپلزپارٹی نے بعد میں اپنا جلوس نکالا اور یہ بھی کچھ کم شاندار نہیں تھا۔ اگر جلسہ جلوس کی نفری کا مقابلہ ہی اصل سیاسی مقابلہ ہے تو اس میں نہ حزب اقتدار پیچھے رہ سکتی ہے نہ حزب اختلاف کے نمبر کم ہوتے ہیں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس طرز سیاست کا کیا فائدہ کہ جہاں بھی جلسہ یا جلوس ہونا ہو وہاں سارے پاکستان سے بسوں ٹرکوں ویگنوں میں بھر کر لوگ لائے جائیں۔ ہمارے ملک میں سینٹ' قومی اسمبلی' صوبائی اسمبلی اور بلدیاتی اداروں کے ہزاروں ارکان ہیں۔ اگر ہر رکن کو ہجوم ڈھونے کے کام پر لگا دیا جائے اور مجمع بازی میں ساری توانائیاں جھونک دی جائیں تو یہ سیاسی توانائی کا ضیاع ہے اور اس مقابلہ کی پھر کوئی حد نہیں اور اس کا حاصل بھی کچھ نہیں۔

یہ کام تو سارا سال جاری رہ سکتا ہے کہ حزب اختلاف سڑکوں پر ہنگامہ آرائی کا شغل کرتی رہے اور حکومت سڑکوں کی ناکہ بندی اور پکڑ دھکڑ میں لگی رہے لیکن اس کارعبث سے کسی بھلے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کا کہنا تھا کہ جلسے میں مسلح لوگ آنے والے تھے جو اہم عمارتوں پر قبضہ کرتے۔ ایسا تھا تو اہم عمارتوں کی حفاظت کیلئے پولیس اور فوج موجود تھی۔ لوگوں کی تلاشی بھی لی جا سکتی تھی کہ ان کے پاس اسلحہ نہ ہو اور جب کوئی پارٹی اپنا جلسہ جلوس یا ریلی کرتی ہے تو اس کی فکر یہ ہوتی ہے کہ امن کے حالات رہیں تاکہ لوگ ان میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں اور ہمارا جلسہ یا مارچ کامیاب رہے جبکہ حکومت کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے ناکام بنانے کیلئے خوف کی فضا پیدا کر دے اور گرپڑ کرانے

کیلئے بھی کچھ آدمی متعین کرے تاکہ مخالفین کا پروگرام درہم برہم ہو جائے۔ اس سلسلے میں تخویف اور تشدد کا اندیشہ سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے تھا' پیپلزپارٹی کی طرف سے کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا کہ اس کی روک تھام ناممکن ہوتی مگر بات یہ ہے کہ حکومت کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا وہ حواس باختہ ہو کر کیا۔

حکومت میں اس گروہ کی رائے دانشمندانہ تھی کہ جن کا خیال تھا کہ پیپلزپارٹی کے پروگرام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ انہیں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا موقع دیا جائے۔ اور اگر بڑے پیمانے کا لانگ مارچ ہوتا ہے تو ہمارے ہاتھ بھی بندھے نہیں ہیں۔ ہم اپنے جوابی مارچ کے ذریعے نہلے پر دہلا مار سکتے ہیں اور اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پیپلزپارٹی ملک کی ایک بڑی پارٹی ہے اگر وہ لاکھ دو لاکھ آدمی جمع بھی کر لے تو کون سی حیرانی کی بات ہے۔ ہمیں لوگوں سے یہ کہنا چاہیئے کہ حکومت تبدیل کرانے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ اپنی اپنی سٹریٹ فورس دکھائی جائے۔ لوگ بھی اس طریقہ کو پسند نہیں کر سکیں گے۔ جونیجو حکومت کی طرح ہم نے بھی پیپلزپارٹی کو اپنے مارچ کے لئے آزادی دی اور حوصلہ کے ساتھ صورت حال سے عہدہ برآ ہو گئے تو ہر طرف ہماری واہ واہ ہوگی اور لوگ کہیں گے کہ پیپلزپارٹی اپنے دور حکومت میں جلسے جلوسوں کو روکتی رہی ہے مگر کیا جونیجو اور کیا نواز شریف یہ سب اس کی اجازت دیتے رہے لیکن حکومت میں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جس کی نہایت گندی اور غیر جمہوری ذہنیت تھی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ "را" کے ایجنٹ ہیں' سب کچھ الذوالفقار کا کھیل ہے' یہ تشدد تخریب اور موت کا بازار گرم کرنا چاہتے ہیں' بغاوت پھیلا رہے ہیں جس سے حکومت کا تختہ الٹ جائے گا' اسی گروہ کا حکومت میں غلبہ تھا اور آخر اس نے وہی کیا جو اس کی طبیعت اور مزاج کا خاتمہ تھا مگر اب یہ حکومت جو پہلے بھی غیر سیاسی طریقوں پر چل رہی تھی' بالکل ہی غیر سیاسی ہو گئی ہے۔

دوسری طرف پیپلزپارٹی کو نجانے یہ لانگ مارچ کیوں سوجھا تھا۔ بجھانے والا جو بھی تھا' اس کی نیت میں ضرور فتور تھا۔ پیپلزپارٹی نے اس "لانگ مارچ" کے ذریعے اپنے خلاف کیا کچھ ثابت کر دیا' ذرا اس پر نظر تو ڈالئے۔

(۱) بے نظیر کچی عقل کی ہیں' ہر ایک کے بھرے میں آجاتی ہیں۔ پہلے انہوں نے "گو بابا" گو بابا" کا نعرہ لگایا پھر بابا سے بالکل ہی صرف نظر کر لیا حالانکہ وہ اصل زخم خوردہ بابا کے اقدام کی ہیں۔

(۲) وہ آٹھویں ترمیم کے خلاف زور و شور سے باتیں کرتی رہیں جس نے ان کے اقتدار کا ستیاناس کیا اور پیپلزپارٹی ہی نہیں ملک کے ہر باشعور شخص کا یہ موقف رہا کہ آٹھویں ترمیم کی تلوار منتخب حکومت پر ہوگی تو جمہوریت کام ہی نہیں کر سکتی۔ یہ ترمیم صدر ضیاء نے اپنے آپ کو مقتدر اعلیٰ بنانے کے لئے کی تھی' اسے فوراً ختم ہونا چاہیے لیکن یہ سب کچھ کہتے کہتے اچانک وہ صدر اسحٰق کے حضور درخواست گزارنے لگیں کہ آٹھویں ترمیم کے تحت موجودہ حکومت کو ختم کر دیں۔ اس سلسلہ میں صدر اسحٰق کی سہولت اور ان کے لئے جواز مہیا کرنے کی غرض سے وہ اسلام آباد تک مارچ پر تیار ہو گئیں۔

(۳) بے نظیر صاحبہ جن اسمبلیوں کے خلاف تحریک چلا رہی ہیں وہ اور ان کے ساتھی ان "حرام" اسمبلیوں میں اپنی تنخواہیں الاؤنسز اور استحقاق "حلال" کر رہے ہیں' تحریک استحقاق بھی پیش کرتے ہیں' اسمبلیوں کے ارکان کے لئے جو فنڈ مخصوص ہیں ان پر بھی ہاتھ مارتے ہیں اور ان سے استعفیٰ کا نام تو لیتے ہیں مگر استعفیٰ دینے کے لئے تیار نہیں۔ ممکن ہے اب کچھ شرم آجائے اور یہ حرام اسمبلیوں سے باہر آئیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب آپ اسمبلیوں کو دھاندلی کی پیداوار اور غیر آئینی ادارے قرار دیتی ہیں تو اتنے دنوں تک ان کے ساتھ کیوں رہیں؟۔ یہ اسمبلیاں بیک وقت حرام اور حلال کس منطق کے تحت ہیں؟۔

(۴) بے نظیر صاحبہ کو دھاندلی کی شکایت ہے اور انتخابات کرانے کے لئے جو نگران وزیراعظم جتوئی صاحب مقرر کئے گئے تھے' اب انہوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ واقعی دھاندلی ہوئی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ بے نظیر صاحبہ پھر اسی طرح کے دھاندلی باز اور موقع پرست عناصر کے جلو میں کیوں نمودار ہوئی ہیں؟۔ وہ ہمارے موقع پرست جو پریذیڈنٹ الیون کہلاتے ہیں' ان سے بے نظیر صاحبہ کی ساز باز سے کیا یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان کا بھی نہ کوئی اصول ہے نہ نظریہ۔ جتوئی ان کے آگے ہیں تو کھر ان کے پیچھے' پیرزادہ بائیں جانب ہیں تو کوثر نیازی داہنی جانب۔ یہ موقع پرستوں کا مجمع اسلام آباد لے جا کر انہوں نے اپنی عزت میں اضافہ نہیں کیا بلکہ یہ تاثر دیا ہے کہ وہ بھی اصولوں سے بیگانہ اور ہر ناجائز کو اپنانے کے لئے تیار ہیں۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہیں نواب زادہ نصراللہ کی اس سفر اسلام آباد میں رفاقت نصیب نہیں ہو سکی اور وہ ان کی معیت میں اسلام آباد پہنچی ہیں جو ہمیشہ بھٹو کے خلاف بے نظیر کے خلاف اور خود ملک و قوم کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

لانگ مارچ کی تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس عرصہ میں صدر اسحٰق اور خود جنرل آصف نواز منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ اگر وہ لانگ مارچ کے خلاف ایک زوردار بیان دے دیتے تو قصہ ہی ختم تھا۔ یہ بیان صرف اس لئے نہیں دیا گیا کہ اس طرح سیاست میں مداخلت ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس تماشہ کی آرزو بھی تھی مگر ان کے پاس اختیار اور طاقت ہے وہ موجودہ حکومت کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو صاف سیدھے طریقے سے ختم کر دیں۔ پہلے کسی نے کیا بگاڑ لیا تھا جو اب آپ کا بگاڑ لے گا لیکن یہ کام کرنے کے لئے اگر انہوں نے سیاست میں شور و شر پیدا کیا ہے تو یہ ایک ایسی روایت ہے جو آخر کار ملک و قوم کے مستقبل پر بری طرح اثر انداز ہوگی۔ اس کی بجائے لانگ مارچ کے ہنگامے سے پہلے وہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ایک میز پر جمع کرتے' ان میں مفاہمت کراتے' ان کو قومی حکومت پر رضا مند کرتے (نئے الیکشن کا بھی سمجھوتہ ہو سکتا تھا) تو مفاہمت ناممکن نہیں تھی۔

صدر اور سالار افواج کے خیال میں حالات ایسے ہو گئے تھے کہ تبدیلی ناگزیر تھی تو وہ قوم کے سامنے صاف بیانی سے کام لیتے اور نئے الیکشن کے لئے کسی غیر جانبدار حکومت کو قائم کرتے۔ یہ کام صاف سیدھے طریقے سے اگر کیا جائے تو لوگ اسے قبول کریں گے اور نئے مینڈیٹ سے نئی حکومت آسکے گی لیکن اس کی بجائے یہ طریقہ غلط ہے کہ پہلے فوجی جنرل اور صدر اسحٰق پیپلزپارٹی کے کٹر مخالف تھے' اب آپس میں گہری گھٹنے لگی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ملک میں جن لوگوں کے پاس اصل اقتدار ہے وہ پہلے ایک پارٹی کی عداوت پر کمربستہ ہوں اور پھر اس کے ساتھ دوستی کے نامہ و پیغام ہونے لگیں۔ اس طرح کے پس پردہ کھیل ملک کو فائدہ نہیں دے سکتے۔ ملک کے فائدہ میں صرف ایک ہی بات ہے کہ بے نظیر اور ان کے مخالف عناصر دونوں ہی مجنونانہ مخالفت کو ترک کر دیں' آپس میں ایک مفاہمت پر پہنچیں اور اس مفاہمت کے تحت نئے حالات میں نئے فیصلے کریں۔-○○

... مشورے ہیں آسمانوں میں

(دوسری اور آخری قسط)

سرد جنگ ختم ہوگئی لیکن مفادات کی جنگ تیز ہوجائے گی

صرف کمیونزم کا خاتمہ کافی نہیں' مغرب کی سردردی ہنوز باقی ہے۔

اخذ و ترجمہ: سردار اعوان

مستقبل کے دشمن بہت چھوٹے چھوٹے اور محدود نوعیت کے ہونگے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض کے پاس جدید اسلحہ اور جنگ جیتنے کے لئے جذبہ کی کمی نہ ہو اور جغرافیائی لحاظ سے بھی ان پر قابو پانا مشکل ہو لیکن کوئی ملک اتنی بڑی طاقت ثابت نہیں ہوگا' جس پر قابو نہ پایا جاسکے۔ البتہ سرمایہ دار جمہوری ممالک کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ تیزی سے کارروائی کر کے جنگ جیتی جائے تاکہ اپنے عوام کی طرف سے تنقید کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس سلسلے میں کی جانے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں بحریہ پر زیادہ ذمہ داری نہیں آئے گی خصوصاً طیارہ بردار سمندری جہازوں پر جن کا استعمال خاصا مہنگا پڑتا ہے اور جن کی حفاظت کا بھی مسئلہ رہتا ہے۔ ماضی میں ان کا استعمال ناگزیر تھا مثلاً فاک لینڈ کی جنگ نیوی کے بغیر نہیں جیتی جا سکتی تھی مگر خوش قسمتی سے اب اس قسم کے واقعات کا کوئی اندیشہ نہیں۔ آئندہ کے جنگی مقامات ہوائی اڈوں کی زد میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ جنگی طیاروں کو زیادہ دور تک مار کرنے کے قابل بھی بنایا جارہا ہے البتہ چھوٹے پیمانہ پر ایٹمی طاقت کے استعمال کے لئے ایٹمی آبدوزوں کی اہمیت زیادہ ہوگی۔ تاہم جب تک وزنی سامان کی نقل و حمل کے لئے اکیسویں صدی کے ہوائی جہاز وجود میں نہیں آتے' سمندری راستے ہی استعمال ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ نیوی کی دوسری تمام ذمہ داریاں ہوائی فوج سنبھال لے گی۔

چونکہ ان جمہوری ممالک میں عوام کو اپنے نوجوانوں کی زندگی بہت عزیز ہے اس لئے زمینی جنگ شروع کرنے سے پہلے دشمن کی حربی صلاحیت تباہ کرنا ہوگی جس کے لئے زیادہ تر توجہ میزائل استعمال ہوں گے لیکن ہوائی جہازوں کا بھی خاصا کردار ہوگا۔ "سٹیلتھ" کی خوبی یہ ہے کہ اسے گرائے جانے کا خطرہ نہیں کیونکہ وہ راڈار میں نہیں آتا۔ اسی طرح اندھیرے اور گہرے بادلوں میں جہاں انسانی آنکھ کچھ دیکھ نہیں پاتی' وہاں "برقی آنکھ" کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔ خلیج کی جنگ میں پہلی مرتبہ ایسا خود کار نظام کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا جو کسی شے کا سراغ بھی لگاتا ہے اور اس پر فائر کی سمت بھی معین کرتا ہے۔ ایٹمی حملہ کے لئے آبدوزیں استعمال ہوں اور ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی ہوائی افواج کو ہتھیاروں کی سپلائی محدود رہے تو امریکہ کو زیادہ بین البراعظمی ہوائی جہاز رکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور نہ ہی جمہوری ممالک کو اپنے دفاع کے لئے زیادہ جنگی طیارے درکار ہوں گے۔ اس کی بجائے زمینی افواج کی حفاظت کے لئے استعمال ہونے والے ہوائی جہازوں کو اس طرح زیادہ دور تک مار کرنے کے قابل بنایا جائے گا کہ ان کی بم لے جانے کی گنجائش کم نہ ہو۔ علاوہ ازیں سرد جنگ کے خاتمہ کے باعث اکثر ممالک اپنے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

اگر جمہوری ممالک اپنی اپنی الگ فوج رکھنے کی بجائے مجوزہ سریع الحرکت فوج قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو زمینی فوج کی تعداد خاصی کم کی

چین پوری ایک صدی میں بھی امریکہ اور یورپ پر حملہ کی استعداد حاصل نہیں کرسکتا۔

جاسکتی ہے لیکن یہ کم فوج پہلے سے بہت مہنگی ہوگی کیونکہ اس کے اعلیٰ معیار اور جدید ٹیکنالوجی میں بھرپور مہارت کی خاطر اسے مسلسل زیر تربیت رہنا ہوگا۔ زمینی فوج میں ٹینکوں کی جگہ ہیلی کاپٹر گن شپ لے رہے ہیں جن کی ایک سو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار اور تین طرفہ حملے کرنے کی صلاحیت کا مقابلہ کوئی ٹینک نہیں کرسکتا۔ ساخت کے اعتبار سے ٹینک کے مقابلے میں ہیلی کاپٹر کمزور ضرور ہے اور خراب موسم میں اس کا استعمال محدود ہو جاتا ہے لیکن حالیہ تجربات نے ثابت کردیا ہے کہ ہیلی کاپٹر نے ٹینک کو میدان جنگ سے باہر کردیا کیونکہ ملٹری کا قانون ہے کہ ہمہ گیر اور چابک دست حریف کے مقابلے میں سست اور یک رخا مدمقابل ہمیشہ مار کھائے گا۔ لہٰذا مستقبل کی زمینی فوج پیدل' توپ خانہ اور ٹینک کی بجائے پیدل' توپ خانہ اور ہیلی کاپٹر مشتمل ہوگی۔

جوہری اسلحہ کی موجودگی نے سرد جنگ کو اپنی مثال آپ بنا دیا تھا کیونکہ اس کے استعمال سے افواج' شہروں اور علاقوں کا ہی نہیں' پوری نوع انسانی کے نیست و نابود ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا مگر اب چھ ایٹمی ممالک میں سے تین یعنی امریکہ' فرانس اور برطانیہ سرد جنگ جیتنے میں اتحادی تھے۔ روس نے اپنا قبلہ درست کرلیا' چین کافی حد تک محتاط نظر آتا ہے جبکہ اسرائیل جمہوری ممالک کا مخالف نہیں۔ جو دو ممالک بھارت اور پاکستان ایٹمی صلاحیت حاصل کرسکتے ہیں' ان کے درمیان امید ہے کوئی نہ کوئی مفاہمت ہو جائیگی۔ جنوبی افریقہ بھی اسے مزید جاری رکھنے کا خواہش مند نہیں مگر جیسا کہ دو ممالک عراق اور شمالی کوریا کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور پر اس سمت میں کوشش کررہے تھے'

ہو سکتا ہے کہ کچھ اور بھی ایسے ملک موجود ہوں۔

بنا بریں فوری سوال یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قائم کرنا ممکن ہے؟۔ امریکہ اور روس کے درمیان طے شدہ تخفیف کی رو سے ۲۰۰۳ء میں امریکہ کے پاس ۳۵۰۰ دور مار ایٹمی ہتھیار رہ جائیں گے جن میں سے ۱۷۰۰ آبدوزوں میں پانی کے نیچے چھپے ہیں۔ اسی سال فرانس اور برطانیہ ہر ایک کے پاس موجودہ تعداد میں ہوشیاری کے ساتھ تخفیف کرنے کے بعد ۳۰۰ سے ۴۰۰ تک کی تعداد ہوگی جو کہ غالباً سارے آبدوزوں میں ہیں۔ روس قریباً امریکی تعداد کے برابر ۳۰۰۰ ایسے ہتھیار رکھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی طاقت امریکہ کے مقابلہ میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کی آبدوزوں میں لگے ہوئے میزائل اتنے صحیح نشانہ پر لگنے والے نہیں اور روس اتنی بڑی تعداد میں جوہری آبدوزوں کی دیکھ بھال کے اخراجات کا متحمل بھی نہیں۔ چین کے پاس اس وقت ۲۰۰ کی تعداد ہے جس میں سے سوا حصہ امریکہ اور یورپ تک مار کرنے کے قابل ہے۔ روس اگر وعدہ خلافی کی کوشش کرتا ہے تو امریکہ کو فوراً پتہ چل سکتا ہے البتہ چین کا سراغ لگانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن چین پوری ایک صدی میں بھی امریکہ اور یورپ پر حملہ کی استعداد حاصل نہیں کر سکتا۔ اصل خطرہ افریقی اور ایشیائی ممالک ہیں جو آخری امید کے طور پر ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں جس کے لئے چوری' غیر دانش مند مغربی تاجروں' بے روزگار سابق روسی سائنس دانوں یا چین سے مدد لی جاسکتی ہے کیونکہ ایسا کوئی عالمی نظام سردست موجود نہیں جس کے ذریعے اس کا تدارک کیا جا سکے۔ ایسے ممالک کی ایٹمی اسلحہ کی طلب ایک آدھ درجن سے زیادہ نہیں جو امریکہ کے مقابلہ میں مونگ پھلی کے دانہ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس صورت میں ایسے کسی ملک میں سریع الحرکت فوج بھیجنا خاصا دشوار ہو جائیگا۔ ایک طریقہ تو یہ ہوگا کہ سب سے پہلے ایسے میزائل بھیجے جائیں جو ان ایک درجن جوہری ہتھیاروں کا پہلے صفایا کریں۔ بشرطیکہ ان کی جگہ کا علم ہو۔ اس کے بجائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ چلائے جائیں تو انہیں فضا میں ہی مار گرایا جائے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تب تک "پیٹریاٹ" کی جگہ زیادہ صحیح مار کرنے والا میزائل تیار ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریگن کا ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قائم کرنے کا فارمولا کام دے جائے جس پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

اس کے لئے آسان ذریعہ یہ ہے کہ فضا میں ایسی حساس لہریں معلق رکھی جائیں جو حملہ کرنے والے میزائلوں کا سراغ لگاتی رہیں لیکن انہیں تباہ کرنے کے لئے میزائل بہرحال زمین سے داغے جائیں گے۔ زمین سے مار کرنے والے میزائل سب سے کم خرچ ہیں اور تیاری میں آسان بھی۔ چونکہ یہ میزائل امریکہ میں تیار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی ضرورت یورپ اور جاپان کو ہوگی لہٰذا ان کا لین دین امریکہ اور یورپ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث ہوگا۔ بعد ازاں اگر فضا سے مار کرنے والے میزائل کی تیاری کامیاب ثابت ہو تو اسے اختیار کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ میزائل مار گرائے جانے والے میزائل کی لاگت سے بہت زیادہ مہنگے نہ پڑیں۔

"سٹیلتھ" کی خوبی یہ ہے کہ اسے گرائے جانے کا خطرہ نہیں کیونکہ وہ راڈار میں نہیں آتا۔

اس وقت امریکہ' جمہوری یورپ' اور جاپان میں عمومی ہم آہنگی پائی جاتی ہے مگر فوجی اعتبار سے صرف جاپان اصل اتحادی ہے کیونکہ جرمنی اپنے فوجی جرمنی سے باہر بھیجنے پر آمادہ نہیں رہا لیکن جرمنوں کو بجا طور پر یہ رویہ ترک کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے درمیان ہم آہنگی کے سلسلہ میں صورت حال یہ ہے کہ یورپ نسبتاً کمزور حیثیت میں ہے اور یورپ کو امریکی سرپرستی کی اب بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی سرد جنگ کے دور میں تھی جبکہ مفادات کی جنگ کے خطرے کا علاقہ---- تہران سے کیسابلانکا تک---- یورپ

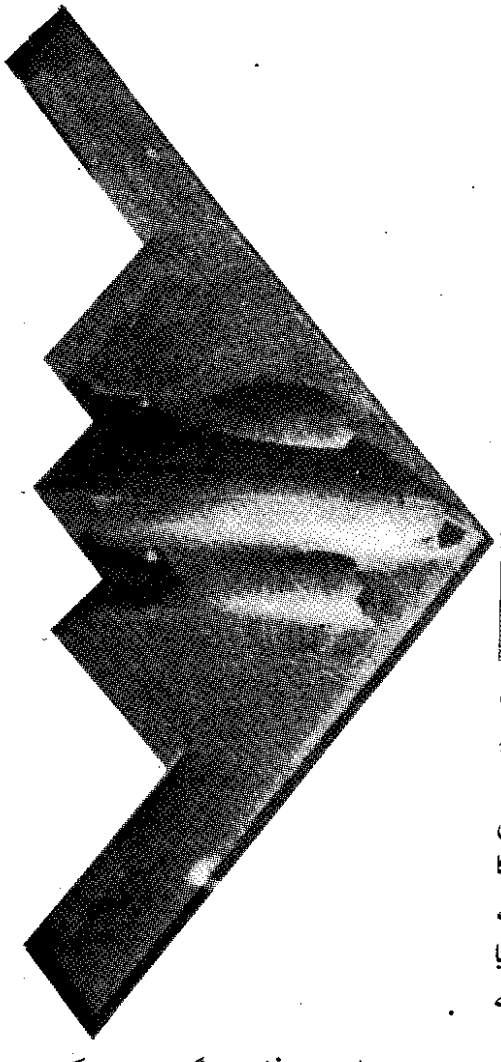

کے ساتھ ملحق ہے۔ نسلی بنیاد پر گڑبڑ کا شکار ہو سکنے والے علاقے جن میں اخلاقی جنگ پیش آسکتی ہے' خود یورپ کے اپنے اندر بہت حد تک موجود ہیں لیکن امریکہ ان حالات کو سرد جنگ کے مقابلے میں اتنا تشویش ناک نہیں سمجھتا۔ امریکہ کے نزدیک پہلے یورپ کو براہ راست روسی تسلط کا خطرہ تھا' اب زیادہ سے زیادہ سرحدوں پر جنگ کی نوبت آسکتی ہے یا پھر اسے اپنے تیل کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تاوان دینا پڑ سکتا ہے ورنہ کوئی آکر اس پر قبضہ تو نہیں کر سکتا اس لئے اب امریکہ اپنے آدمی اور روپیہ یورپ کے دفاع پر خرچ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوگا۔ یورپ اپنے ان مفادات کے تحفظ کے لئے خود انتظامات کرنے کا سوچ سکتا ہے مگر اس کے لئے وقت اور پیسہ درکار ہوگا۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ نیٹو کی طرز کا ایک ڈھیلا ڈھالا اتحاد ہو اور ایسی صورت حال میں کہ بعض اتحادی ممالک کسی فوجی کارروائی کے حق میں

یورپ نسبتاً "کمزور حیثیت میں ہے اور یورپ کو امریکی سرپرستی کی اب بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی سرد جنگ کے دور میں تھی جبکہ مفادات کی جنگ کے خطرے کا علاقہ تہران سے کیسابلانکا تک یورپ کے ساتھ ملحق ہے۔

ہوں اور بعض اس کے خلاف تب بھی کارروائی کے حق میں ممالک نیٹو کی مدد سے اپنی فوجیں میدان جنگ میں اتار سکیں' نیٹو کے لئے مختص شدہ اپنے ٹینک روانہ کر سکیں اور نیٹو کے فضائی سراغ رسانی کے نظام سے فائدہ اٹھا سکیں یہاں تک کہ نیٹو کی مشترک کمان استعمال کر سکیں وغیرہ لیکن اس طرح کا اتحاد تا دیر چلنے والا نہیں ہوگا۔ کسی ایک مخصوص دشمن کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اتحاد عمل میں آیا ہو' اسے کسی ایسے نظام میں تبدیل کرنا مشکل ہوتا ہے جس کے پیش نظر چھوٹے چھوٹے کئی دشمن ہوں لہٰذا ایک نیا اتحاد قائم کرنا ضروری ہوگا جو علاقائی کے بجائے عالمی نوعیت کا ہو اور جس میں شامل ہر رکن کی اہمیت تسلیم کی جائے۔ اس کی ابتدا اس طرح کی جاسکتی ہے کہ:

۱۔ بنیادی طور پر امریکہ' کینیڈا' نیٹو کے ممالک بشمول ترکی اور دیگر جمہوری ممالک میں سے سویڈن' آسٹریا' فن لینڈ سوئیٹزرلینڈ اور جاپان یک جا ہوں اور جاپان کے بارے میں یہ واضح کردیا جائے کہ وہ فی الحال فوجی کارروائی میں حصہ نہیں لے گا۔ بعد ازاں اس میں پولینڈ' ہنگری اور چیک جمہوریاؤں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تمام رکن ممالک یہ طے کریں کہ کسی ایک رکن ملک کے خلاف خطرہ تمام ممالک کے خلاف تصور ہوگا۔ اس فارمولے کے تحت شمالی کوریا کی جانب سے جنوبی کوریا پر حملے کی صورت میں امریکہ اور جاپان اتحادیوں کی اس تنظیم کی مدد طلب کر سکتے ہیں۔ اس کے بدلے میں آئندہ خلیج جیسی کسی جنگ میں جاپان فوجی نہیں بلکہ روپیہ پیسہ اور جنگی سامان میں حصہ ادا کرے۔

۳۔ تمام رکن ممالک بماسوائے جاپان' ایک سریع الحرکت فوج قائم کریں جس کی ایک مشترک کمان ہو۔ اس میں شامل یورپی فوج امریکہ میں تربیت حاصل کرے' اس لئے کہ امریکہ میں بہترین تربیتی سہولت موجود ہے جہاں بیک وقت دو دو سو جنگی طیارے جنگی مشقوں میں حصہ لیتے ہیں اور امریکیوں کو یہ احساس دلانے کے لئے بھی کہ فی الواقع یورپ اور امریکہ ایک ہیں۔

تمام دفاعی پیداوار اس تنظیم کے تحت ہو۔ سراغ رسانی کا برقی نظام بھی مشترک نظام کے تحت ہو تاکہ امریکہ' یورپ اور جاپان کی مدد سے اسے مزید بہتر بنا سکے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ یورپ اور جاپان کو بھی اطمینان ہوگا کہ امریکہ کو اس میں اجارہ داری حاصل نہیں رہی۔ اس نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ یورپ ایک وحدت کے طور پر اس کا حصہ ہو یعنی امریکہ' یورپ اور جاپان کے درمیان سہ طرفہ قسم کا معاہدہ ہونا چاہئے۔ یورپی ممالک کی الگ الگ شمولیت سے فوری اور بروقت فیصلے کرنے کی صلاحیت کمزور ہوگی تاہم اس میں شرکت برابری کی بنیاد پر نہیں ہوگی کیونکہ امریکہ کو بہرحال فوقیت حاصل رہے گی۔

اس مجوزہ اتحاد کا مقصد جمہوری ممالک کی فوجی صلاحیت میں اضافہ کرنا ہے تاکہ ان کے مفادات کا بہترین طور پر دفاع کیا جاسکے۔ اس سے دنیا میں ظلم و استبداد کے خاتمے میں مدد ملے گی اور جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا۔ دنیا پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ صرف کمیونزم کا خاتمہ ہی کافی نہیں' ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے!۔○○

گر تو برا نہ مانے

جماعت اسلامی پر ہی زور کیوں؟

محمد سمیع۔ کراچی

علامہ اقبال نے نئی تہذیب کے جن گندے انڈوں کو اٹھا کر باہر گلی میں پھینکنے کا مشورہ دیا تھا وہ ہمیں اتنے محبوب ہیں کہ ہم نے انہیں سینے سے لگا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب محمد عبداللہ ایڈووکیٹ صاحب نے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کو اسلامی انقلابی "لیڈر" کے خطاب سے اس مضمون میں نوازا ہے جس کی پہلی قسط روزنامہ "جسارت" کی ۴ر نومبر کی اشاعت میں شامل ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کبھی لیڈری کا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے لئے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ امیر تنظیم اسلامی پاکستان' سرپرست اعلیٰ انجمن خدام القرآن اور داعی تحریک خلافت پاکستان ہیں۔

مضمون اس تمہید کے ساتھ شروع کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس کرنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رہ گیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی پر تنقید کرتے چلے جائیں اس لئے کہ بقول فاضل مضمون نگار کے "انکے (ڈاکٹر صاحب کے) تازہ فلسفہ کے مطابق اسلامی انقلاب ان کی ذمہ داری نہیں رہی کیونکہ اسلامی نظام کے قیام کا عظیم کام پوری انسانی تاریخ میں آج سے قبل صرف ایک ہی بار ہوا ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے اور آئندہ بھی صرف ایک ہی بار ہوگا"۔ مغالطہ رفع کرنے کے لئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی انقلاب لانے کا دعویٰ کبھی کیا ہی نہیں۔ انہوں نے تو اس منزل پر پہنچنے کے لئے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ ان کے مطابق اسلامی انقلاب کی تکمیل "ایک حیات انسانی" یعنی Single life span میں صرف ایک ہی بار ہوا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ہوا اور اب ان جیسا عظیم صفات کا حامل انسان قیامت تک پیدا نہیں ہوگا لہٰذا یہ کام کسی ایک فرد کی زندگی کے اندر ممکن نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے مختلف داعی اپنی زندگی میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے جائیں گے جس کی مثال انہوں نے اولمپک ٹارچ سے دی ہے جسے مختلف کھلاڑی مختلف فاصلوں تک لے کر دوڑتے رہتے ہیں تو یہ ٹارچ اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔

اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان نے اسلامی انقلاب کو ہی اپنی منزل بنالیا ہے جبکہ تنظیم اسلامی کے ارکان اسے منزل پر پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے فطری رفتار سے آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں جبکہ جماعت اسلامی والے چونکہ اسلامی انقلاب ہی کو اپنی منزل سمجھنے لگے ہیں لہٰذا اس کو جلد از جلد پالینے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کر کے سیاست کی بھول بھلیوں میں ایسے گم ہوئے ہیں کہ منزل ان سے دن بدن مزید دور ہوتی چلی جارہی ہے۔

اگر فاضل مضمون نگار کی اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ کسی پر تنقید کرنا اپنے کام کو تج دینے کے مترادف ہے تو ڈاکٹر صاحب موصوف سے زیادہ تنقیدیں تو جماعت اسلامی کے اکابرین اپنے ہم عصر سیاستدانوں اور جماعتوں پر کرتے رہے ہیں۔ اس سے کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ جماعت اسلامی کے پاس کرنے کے لئے اور کوئی کام نہیں رہ گیا سوائے دوسروں پر تنقید کے۔ بر سبیل تذکرہ کسی عالم دین کا مولانا مودودی مرحوم کی تحریروں پر اس ریمارک کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ مولانا مودودی کی تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے قلم کی کاٹ جتنی تیزی سے دشمنان دین کے خلاف چلتی ہے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے رجال دین کے خلاف بھی چلتی ہے (روایت بالمعنی) اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریروں کی زد میں آنے سے نہ علماء دین بچے نہ صوفیائے عظام حتیٰ کہ صحابہ تک نوبت پہنچ گئی۔ اور اس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی تصنیف "خلافت و ملوکیت" ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے جماعت اسلامی کے تیسرے بحران پر مضمون لکھا ہے تو اس کا مقصد اس بحران کی شدت کو ظاہر کرنا نہیں بلکہ اس کے پس پردہ اس عامل کی نشاندہی ہے جو بار بار بحرانوں کا سبب بن رہا ہے اور وہ ہے جماعت اسلامی کا انتخابی سیاست میں حصہ لینا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور خطابات کے ذریعے دو اور دو چار کی طرح اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ جماعت اسلامی کی اس پالیسی سے فائدے سے زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس نکتہ کے ہر پہلو پر انہوں نے مدلل گفتگو کی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ جماعت اسلامی کے "باشعور" ارکان ان کی اس بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں اور یہ جماعتی عصبیت کی انتہا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے ڈاکٹر صاحب کے کام کی نوعیت کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں انہوں نے سیاست خلافت پر ہونے والے سیمینار کا تذکرہ کیا ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو عقل کل تصور نہیں کرتے چنانچہ وہ اپنی کسی بھی رائے پر لوگوں کو بحث و تمحیص کی دعوت دیتے رہتے ہیں تاکہ اگر ان کی فکر میں کوئی خامی ہو تو وہ سامنے آجائے۔ ماضی میں دینی فرائض کے جامع تصور پر بھی انہوں نے علماء کرام کو گفتگو کی دعوت دی تھی۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے دوسرے لوگوں کو ان کی آراء اور اظہار خیال کا جو موقع فراہم کیا ہے وہ ایک نادر مثال ہے جو اب تک کسی اور جماعت نے قائم نہیں کی۔

مولانا مودودی مرحوم نے جماعت کی پالیسی یہ بنائی تھی کہ دوسروں کے اعتراضات کا جواب نہ دیا جائے جس نے اس جماعت کے ارکان کو دوسروں کی آراء پر کان نہ دھرنے کا عادی بنا دیا ہے۔ یہ بات میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ حال ہی میں جماعت اسلامی کے ایک سابق امیر کا ایک خط میری نظروں سے گذرا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ ایک طرف ڈاکٹر صاحب انتخابی سیاست کو اسلامی انقلاب کے لئے نا مناسب سمجھتے ہیں اور دوسری طرف "کلاشنکوفی سیاست" بھی اس کا حل نہیں، تو آخر درمیانہ راستہ کون سا ہے، ڈاکٹر صاحب یہ نہیں بتاتے۔ حالانکہ اس موضع پر ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے ساتھ ساتھ آڈیو اور وڈیو کیسٹ بھی موجود ہیں۔ جب امیر اور امراء کی بے خبری کا یہ عالم ہے تو عام ارکان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب پر یہ اعتراض بھی اکثر کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے طریقہ کار پر اتنے مصر کیوں ہیں اور اس کے لئے ان کا زور جماعت اسلامی ہی پر کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اقامت دین کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے لیکن ان کی اپنی تنظیم ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ مشن کے حصول کے لئے ایسے اقدام کر سکے جو جماعت اسلامی کر سکتی ہے۔ جماعت اسلامی اس ملک کی واحد جماعت ہے جس کے پاس ایسے پرخلوص کارکنوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو اسلام کے انقلابی فکر سے ذہنی مناسبت رکھتے ہیں چنانچہ اپنے مثالی نظم کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کے طریقہ کار پر عمل کر کے وہ اس مشن کو حاصل کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کسی تحریر میں جماعت اسلامی کے کارکنان سے یہ نہیں کہا کہ وہ تنظیم اسلامی میں شامل ہو جائیں بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی انقلابی طریقہ کار کو اختیار کر لے تو وہ اپنے کارکنوں سمیت جماعت اسلامی میں دوبارہ شامل ہونے کے لئے تیار ہیں۔ ان کی یہ پیشکش ہی ان کے خلوص کی مظہر ہے جو وہ اس مشن سے رکھتے ہیں اور پھر یہ دین کی تعلیم بھی تو ہے کہ راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ پر لانے کی کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں جماعت اسلامی اپنی راہ سے ہٹ گئی ہے لہٰذا وہ اسے واپس لانے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں، اس امید پر کہ "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو"۔

ویسے فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں جو دعویٰ کیا ہے کہ "الدین النصیحہ" اور "احقاق حق اور ابطال باطل" جیسے دعوے صرف مسلمہ مسائل اور نصوص صریحہ کے معاملہ ہی میں کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے اس دعوے کی کوئی بنیاد یقیناً ہوگی۔ مجھ جیسے کم علم افراد کے لئے اس بارے میں کسی حوالے کا تذکرہ بے حد مفید ہوگا۔

ماہنامہ میثاق لاہور
کی اشاعتِ خصوصی۔ بابت اکتوبر ۱۹۹۲ء

- جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران
- اسلام اور پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش
اس میں مذہبی جماعتوں کا کردار اور اس کا متوقع نتیجہ!
- مولانا مودودی مرحوم اور میں

تمام تحریریں ازقلم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی

- صفحات ۱۲۸ • اس شمارے کی قیمت ۱۰/- (سالانہ زرتعاون ۵۰/-)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

سیاست خلافت پر آخری مذاکرے میں پڑھا جانے والا ایک مقالہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

تحریک سے پہلے علمی و فکری تیاری ضروری ہے

ڈاکٹر اسرار احمد کے پیش کردہ نظام خلافت کے خدوخال پر شق وار تبصرہ

سیاسی جماعت کے قیام کی اجازت مشروط ہونی چاہیے

مفتی محمد خاں قادری

۹ر دستوری نکات کے بارے میں ہماری رائے

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ۹ ر دستوری نکات بیان فرمائے ہیں۔ پہلا نکتہ اجتماعی خلافت سے متعلق ہے ۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب ریاست کی مسلمان رعایا کی آزادانہ مشاورت سے ہوگا اور اس انتخاب میں تمام بالغ مسلمانوں کو یکساں طور پر حق رائے دہی حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ نقطہ نظر بالکل درست ہے اور ہمیں اس سے مکمل اتفاق ہے ۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ انتخابات میں بحیثیت امیدوار سامنے آنے والوں کی سیرت و کردار کی چھان پھٹک کا موثر بندوبست ضروری ہے ۔ البتہ اس سلسلہ میں چند بنیادی باتیں پیش نظر رکھنا ہونگی۔

۱۔ ہمیں قرآن و سنت سے وہ اوصاف تلاش کرنے ہونگے جو اسلامی ریاست کی مقننہ کے اراکین کے لئے ضروری قرار دئے گئے ہوں ۔ پھر وہی اوصاف امیدوار کی چھان پھٹک کے لئے معیار قرار دئے جائیں۔

۲۔ امید وار کی چھان پھٹک کا نظام نہایت موثر ہونا چاہیے کیونکہ عصر حاضر میں جرائم کی انتہائی مہذب صورتیں وجود میں آچکی ہیں۔ قرضے لے کر صنعتیں لگانا پھر چند سال خوب کمائی کرنے کے بعد انہیں ناکارہ ثابت کر کے قرضہ معاف کروالینا ہمارے کسی بھی ضابطہ اخلاق میں کوئی جرم تصور نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ہماری مجبوریوں نے ہمیں یہاں لاکھڑا کیا ہے کہ ہم بھاری رقوم لے کر ملازمت دلوانے والے کو بھی قوم کا خادم کہنے پر مجبور ہیں۔ الغرض قوم کو لوٹنے اور قومی خزانے پر دست درازی کی ایسی صورتیں ایجاد ہوچکی ہیں کہ ہمیں چھان پھٹک کے نظام کو بھی اتنا ہی موثر او UP-TO-DATE بنانا پڑے گا۔

۳۔ چھان پھٹک کا نظام افراط و تفریط سے پاک ہونا چاہئے ۔ ایسا ڈھیلا ڈھالا بھی نہ ہو کہ بے مقصد اور بے روح بن کر رہ جائے اور ایسا کڑا اور سخت بھی نہ ہو کہ امید وار کے انتخاب میں فیصلہ کن عامل ہی بن جائے اور ووٹر کا حق رائے دہی بھی متاثر ہونے لگے۔ یعنی چھان پھٹک کے مراحل سے گزرنے کے بعد امیدوار صرف انتخاب میں حصہ لینے کے قابل بن سکے ۔ رہ گیا مسئلہ اس کے انتخاب کا تو اسے رائے دہندگان پر چھوڑ دیا جائے۔ چھان پھٹک کا نظام اس کے انتخاب میں بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی کردار سرانجام نہ دے سکے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات مبارکہ اس سلسلہ میں موثر رہنمائی کرتی ہیں جن سے مقننہ کے اراکین کے درج ذیل اوصاف کھل کر سامنے آجاتے ہیں (۱) مسلمان ہونا(۲) کبائر سے اجتناب (۳) متحمل مزاج (۴) مشاورۃ المزاج (۵) صاحب علم(۶) صاحب بصیرت (۷) صاحب وجاہت(۸) خدمت خلق کرنے والا

ان اوصاف میں سے بعض نظام کا حصہ بن سکتے ہیں اور بعض کے لئے لوگوں کی شعوری سطح کو بلند کیا جائے تاکہ انتخاب کرتے وقت ان اوصاف کا لحاظ رکھ سکیں۔

مہم جوئی قابل اعتراض ہے

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے امیدواروں کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے۔ ہمیں امیدواری کے تصور پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن مہم جوئی پر سخت اعتراض ہے جو کہ مروجہ نظام کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ہمارے خیال میں امیدواری کے تصور پر اس قدر لے دے نہ ہوتی اگر مروجہ نظام کے تحت "مہم جوئی" کی حشر سامانیاں پوری طرح جلوہ گر نہ ہوتیں۔

مہم جوئی کی نہ تو شریعت میں گنجائش ہے اور نہ ہی یہ جمہوری عمل کے لئے ساز گار ہے۔ اسی تصور مہم جوئی نے MONEY POLITICS یعنی پیسے کی سیاست کو جنم دیا ہے' اسی نے ہارس ٹریڈنگ کو فروغ دیا ہے' اسی سے شرفا اور اہل حضرات کی پگڑیاں اچھلتی ہیں اور اسی سے نااہلوں کے سروں پر کرامت کے تاج سجائے جاتے ہیں ۔ پراپیگنڈہ کی مکروہ اصطلاح اسی تصور کی پیدا وار ہے ۔ صحافت کے تقدس کو مجروح

کرنے کی ذمہ داری بھی اسی تصور مہم جوئی پر عائد ہوتی ہے ۔ میدان سیاست پر سرمایہ داروں ، جاگیرداروں اور وڈیروں کا تسلط بھی اسی کا مرہون منت ہے ۔ اگر مروجہ نظام سیاست سے اسی تصور مہم جوئی کو ھی ختم کردیا جائے تو سیاست کے دامن پر لگے ہوئے بہت سے داغ دھل سکتے ہیں ۔

حاصل کلام کے طور پر ہم جس امید واری کو جائز سمجھتے ہیں وہ مہم جوئی کی جملہ قباحتوں سے پاک ہے بلکہ یوں کہیے کہ ہم امیدواری کے جواز ر عدم جواز کو ثانوی درجے میں رکھتے ہیں ۔ ہمارا اصل مسئلہ مہم جوئی کے تصور سے نجات ہے ۔ مہم جوئی کے بغیر انتخاب کی اہمیت کیا ہوگی ' یہ آج کی نشست کا موضوع نہیں' ان شاء اللہ العزیز اس کا ذکر تفصیلی کام کے تحت آئیگا۔

دوسرا نکتہ ریاست کے اعضائے ثلاثہ اور ان کے دائرہ ہائے کار سے متعلق ہے ۔ ہمیں ریاست کے اعضائے ثلاثہ یعنی مقننہ ' عدلیہ اور انتظامیہ کی مجوزہ ہیئت اور دائرہ کار سے چند اضافوں کے ساتھ مکمل اتفاق ہے ۔

تین اہم تصورات

۱ اول یہ کہ مقننہ کے حق قانون سازی کے حوالے سے ہم بلاواسطہ جمہوریت کے فراہم کردہ تین تصورات کو بہر صورت اپنے دستور میں جگہ دیں۔ ایک تو یہ کہ اسلامی ریاست کے عام شہری کو بھی یہ حق حاصل ہو کہ وہ کسی بھی مسودہ کو قانون بنانے کے لئے مقننہ کے سامنے پیش کرسکے ۔ اسے اصطلاح میں تحریک گزاری کہتے ہیں۔ ہر چند کہ اسے قانون بنانے کا فیصلہ مقننہ ہی کرے ۔

۲ دوسرا یہ کہ جملہ قانون سازی میں نہیں البتہ آئینی ترامیم کی منظوری اور ایسے اہم قوانین جن کا عوام سے براہ راست تعلق ہو' رعایا سے براہ راست استصواب کیا جائے ۔ اسے اصطلاح میں استصواب عام کہا جاتا ہے

۳ تیسرا یہ کہ عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے نمائندوں کو اپنے فرائض میں کوتاہی و بددیانتی کے ارتکاب پر واپس بلاسکیں ' اسے اصطلاحا" باز طلبی کہا جاتا ہے ۔

یہ تینوں تصورات ' سوئٹزر لینڈ میں کامیابی کے ساتھ رائج ہیں ' امریکہ میں بھی ریاستی سطح پر ان میں سے بعض طریق رائج ہیں۔

ثانیا عدلیہ کی آزادی اور بالادستی کو دستوری حیثیت دی جائے اور اس کا عملاً اہتمام کیا جائے ۔ کیونکہ عدلیہ کو آزادی کا حق دئے بغیر اس سے عدل کی توقع نہیں کی جاسکتی اور بالادستی کا حق دئے بغیر پارلیمینٹ کی قانون سازی اور اجتہاد کو قرآن و سنت کی روشنی میں پرکھنے کا کوئی معقول راستہ نظر نہیں آتا۔ ثالثاً عوام کے اس حق کو دستوری حیثیت ملنی چاہیے کہ وہ جب چاہیں جہاں چاہیں انتظامیہ کی کوتاہیوں ' بداعمالیوں اور اور بے اعتدالیوں پر ان کا احتساب کرسکیں۔

پارلیمینٹ اور قانون سازی

تیسرا اور پانچواں نکتہ دراصل ایک دوسرے کا نتیجہ ہی ہیں ۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ کسی بھی اجتہاد کو قانون کا درجہ دینے کا حق پارلیمینٹ کے پاس ہو= پارلیمینٹ کی یہ قانون سازی قرآن وسنت کے تابع ہو ۔ مزید برآں ریاست کی اعلیٰ عدالت کو یہ اختیار ہو کہ وہ اس امر کا جائزہ لے سکے کہ پارلیمینٹ نے جو قانون سازی کی ہے وہ فی الواقع قرآن و سنت کے تابع ہے یا نہیں ۔ اور فیصلے کے بعد بھی نظر ثانی کی گنجائش باقی ہونی چاہیے ۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس تجویز سے مکمل اتفاق ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے عدلیہ کی جس دو عملی اور ثنویت کا ذکر فرمایا ہے ' اصولی طور پر ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ یہ بات مناسب نہیں لگتی کہ اسلامی ریاست میں عام اعلیٰ عدالتیں الگ ہوں اور شریعت کورٹ الگ قائم کی جائے ۔ لیکن مسئلہ کی نزاکت' اہمیت' پارلیمینٹ کی صورت حال اور مروجہ عدلیہ کی حیثیت کے پیش نظر ہم اتنا اضافہ ضرور کریں گے کہ پارلیمینٹ کی قانون سازی کے تابع شریعت ہونے کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ایک خصوصی عدالت قائم کرنی چاہیے۔ اس عدالت کا نام بے شک ملک کی دوسری عدالتوں سے جداگانہ ممیز نہ ہو لیکن دائرہ کار کو بہرحال ممیز کرنا پڑے گا

ہمارے خیال میں یہ تصور عدلیہ کی مروجہ اقدار کے بھی منافی نہیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نظر نہیں آتی۔ ہر عدالت کا دائرہ کار الگ الگ ہوسکتا ہے اور ان عدالتوں کے جج صاحبان کے انتخاب کے حوالے سے انکی ذمہ داریوں کی نوعیت کے پیش نظر تقویٰ اور عدل کی بنیادی شرائط کے علاوہ حسب ضرورت اضافی شرائط عائد کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ پرائمری کے بچوں کو پڑھانے کے لئے بی ایڈ یا ایم ایڈ استاذ کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایم اے کی کلاسز پڑھانے کے لئے استاذ پر ڈاکٹریٹ کی اضافی شرط لگائی جاسکتی ہے ۔ ویسے بھی سپیشلائزیشن کا دور ہے ۔ آپ دل کے مریض کو ہڈیوں کے سرجن کے پاس نہیں بھیج سکتے ۔

سیاسی جماعت کے قیام کی شرائط

چوتھا نکتہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل سے متعلق ہے۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ خیالات سے اتفاق ہے لیکن ہم یہ تجویز کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل کے حوالے سے انہوں نے جس ایک پابندی کا ذکر فرمایا ہے وہ ناکافی ہے۔ ہماری دانست میں سیاسی جماعت کی تشکیل ایسا حق نہیں جو ہر شہری کو بلا امتیاز دیا جاسکے ۔ البتہ اپنی آزادانہ مرضی سے کسی بھی سیاسی جماعت میں شمولیت کا حق ہر کسی کو یکساں طور پر دیا جاسکتا ہے ۔

ہم ایک محلے کی سطح پر قائم ہونے والی انجمن کی رجسٹریشن بھی اس وقت تک نہیں کرواسکتے جب تک ۲۰ر ۱۰ افراد ایسے تیار نہ کرلیں جو قلبا" و قالبا" انجمن کے اغراض و مقاصد سے متفق ہوں ۔ اور اپنے معینہ اہداف کے حصول کے لئے عملی جدوجہد کرنے کے لئے رضا مند ہوں۔ لیکن ملک گیر سیاسی جماعت بنانی ہو تو پریس کانفرنس طلب کر کے اعلان کردینا ہی کافی ہوتا ہے اور بسا اوقات پریس کانفرنس کے بغیر بھی سیاسی جماعتیں جنم لیتی رہتی ہیں بلکہ ہمارے صحافی بھائی ان کی رضاعت کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کی تشکیل کے حوالے سے کامل آزادی کے باعث آج ہم میں سے جس کی رگ قیادت پھڑکتی ہے وہ نئی جماعت بنالیتا ہے ۔

اگر غور کریں تو ہمارے ہاں کثیر سیاسی جماعتوں کا رجحان اس لئے ہے کہ ہم اصولی ' نظریاتی اور اساسی یا جزوی نوعیت کے اختلافات کی بجائے ذاتیات کی بناء پر سیاسی جماعتیں بناتے ہیں

۔ اس کی نمایاں ترین وجہ یہ ہے کہ ہمارے قائدین بالعموم برگد کا وہ درخت بن جاتے ہیں جس کے نیچے کوئی شے پھل پھول نہیں سکتی ۔ قیادت کی ہوس ان کا یہ حال بنادیتی ہے کہ بقول مرزا غالب۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

اسلام میں اختلاف رائے کی گنجائش ضرور ہے لیکن ہم ذاتیات ہی کو اختلاف رائے کا نام دیکر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہتے ہیں

امت کے اختلاف رائے کے حوالے سے اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ اختلاف اصولی ہونا چاہئے اور فریقین کو اسے رواداری سے برداشت کرنا چاہئے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم رواداری کو ترک کر کے ذاتیات کی بناء پر اختلاف کرتے ہیں اور اسے اختلاف رائے کا نام دے دیتے ہیں۔ اس اختلاف رائے کو بھی مزید حوالے سے چوتھی صدی ہجری کے احوال سے سمجھیں تو بات بالکل واضح ہوجاتی ہے ۔ علمی و فکری آزادی اور اختلاف رائے کی بناء پر جب متعدد مکاتیب فکر وجود میں آنے لگے تو ارباب علم ودانش اور ارباب بست وکشاد کو رک کرسوچنا پڑا کہ چار متفق علیہ اور موثر ترین مکاتیب فکر پر اکتفا کیا جائے اور آئندہ نیا مکتبہ فکر بنانے کی بجائے ان چاروں میں ایک کو اپنا کر اپنا علمی وتحقیقی سفر جاری رکھا جائے تو اس سے امت بہت سے فتنوں سے بچ سکتی ہے۔

جس طرح مذہبی میدان میں فکر انسانی نے اختلاف رائے کو سمیٹ کر قوم کو نت نئے فتنوں سے نجات دلائی اسی طرح آج بھی سیاسی جماعتوں کو معینہ اصول وضوابط کے مطابق باہم مشاورت سے محدود کر کے ہم مروجہ سیاست کے بہت سے فتنوں سے بچ سکتے ہیں۔

جمہوریت کی بقا اور استحکام کیلئے کثیر جماعتی نظام کی بجائے دو جماعتی' سہ جماعتی یا قلیل جماعتی نظام کو خود اہل سیاست بھی بہتر خیال کرتے ہیں اور اس کا عملی مظاہرہ برطانیہ اور امریکہ میں ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ ہم امیدوار پر تو اسکی چھان پھٹک کے حوالے سے کچھ شرائط لگانا چاہتے ہیں لیکن سیاسی جماعت کو جس کی کوکھ سے سینکڑوں امیدوار جنم لیتے ہیں بے لگام چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہم غلط بنیادوں پر ایک مضبوط اور خوبصورت عمارت کی تعمیر کا جھوٹا خواب دیکھ رہے ہیں۔

حدیث "الائمہ من القریش" کے اوپر معترضین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو یہ فضیلت قریشت کی بنیاد پر دی۔ ان کے اس اعتراض کے رد میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ قریش کو انصار پر یہ ترجیح قریش کے سیاسی زور واثر کی بنیاد پر دی گئی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حدیث "الائمہ من القریش" میں جہاں بہت سی دیگر حکمتیں اور معارف پنہاں ہیں' وہاں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ امت کو سیاسی محاذ پر کام کرنے والے حضرات کے انتخاب کے بارے میں ایک اشارہ دے دیا گیا ہے۔ اسی طرح کے اشاروں کو سامنے رکھ کر سیاسی جماعتوں کی تشکیل کے حوالے سے مختلف شرائط اور پابندیوں کا نظام وضع کیا جا سکتا ہے۔ سردست وہ نظام بیان کرنا مقصود نہیں البتہ اس سلسلہ میں چند اساسی اصول عرض کئے دیتے ہیں۔

اول ایسا نظام وضع کیا جائے جو ہمارے اصولی اختلاف رائے کے حق کو محفوظ کرتے ہوئے ہمیں من حیث القوم وحدت اور یکجہتی کی شاہراہ پر گامزن کر سکے۔ صوبائی' علاقائی' لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کو میدان سیاست کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔

دوم یہ نظام اس قدر جامع اور موثر ہے کہ سیاست میں تشدد کے رجحانات کا قلع قمع کیا جا سکے۔ جہاں کہیں ایسے جراثیم نظر آئیں انہیں شروع سے ہی پوری قوت کے ساتھ کچل دیا جائے۔ اس لئے تشدد سیاسی جماعتوں کو بالآخر پاپائیت اور فاشزم تک لے جاتا ہے۔

ثالثاً یہ نظام سیاسی جماعت تشکیل دینے والوں کی سیرت وکردار کی بھی مکمل چھان پھٹک کرے۔ ہمارے ملک میں بے کردار جھوٹے اور بہروپئے حتیٰ کہ وطن دشمن عناصر بھی سیاسی جماعتیں بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اختلاف فقہی کا حل

چھٹا نکتہ فقہی اختلافات اور ان کے حل سے متعلق ہے۔ فقہی اختلافات کے حل کے لئے پیش کردہ فارمولا سے بھی ہمیں اتفاق ہے۔ البتہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ دو تجاویز میں سے دوسری تجویز پسند ہے یعنی ملک کی آبادی کی اکثریت جس فقہ کی پیرو ہو' پبلک لاء میں اسی کو نافذ کردیا جائے۔ اس تجویز کی پسندیدگی کے تین اسباب ہیں۔ اول یہ کہ یہ روح جمہوریت کے قریب تر ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس پر بآسانی اتفاق رائے ہو سکتا ہے ۔ ثالثاً قابل عمل ہے کہ اس کا تجربہ ہمارے پڑوسی ملک ایران میں کامیابی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

ساتواں نکتہ صدارتی وفاقی نظام سے متعلق ہے۔ یعنی اسلامی ریاست کا نظام صدارتی وفاقی ہو۔ یہ وہ تجویز ہے جو ہمارے دل کی آواز ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ جغرافیائی' لسانی اور ثقافتی حقائق کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ بااختیار نئے صوبوں کی تشکیل بھی اس وقت ہمارے ملک کی زبردست ضرورت ہے۔ یہاں صدارتی نظام بمقابلہ پارلیمانی اور وفاقی ریاست بمقابلہ وحدانی کے تقابل اور صدارتی وفاقی نظام کے محاسن بیان کرنے کا موقع نہیں۔ اس پر ہم تفصیلاً الگ مضمون کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ سردست انکی تائید میں ایک معروضی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں۔

پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے پہلے آئین یعنی آئین ۱۹۵۶ء میں پارلیمانی نظام کو جگہ دی گئی۔ صاف ظاہر ہے پالیمانی نظام میں ہیرو وزیراعظم ہوتا ہے اس لئے صدر کو اس آئین کے تحت حکومت اور مملکت کے علامتی سربراہ کا درجہ دیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ٹھیک ڈھائی سال بعد ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پے در پے بحرانوں کے بعد اس آئین کی بساط لپیٹ دی گئی' پارلیمانی حکومت ناکام ہوگئی اور اس ناکامی کا جائزہ لینے کیلئے صدر ایوب نے آئین کمیشن بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس آئین نے ۱۹۵۶ء پارلیمانی نظام کی ناکامی کے علاوہ ایک تحفہ یہ بھی دیا کہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان اختیارات کی کشمکش کا آغاز ہوگیا۔

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۸ر جون ۱۹۶۲ء تک ملک پر مارشل لاء کا دور دورہ رہا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں نیا آئین مرتب ہوا۔ اس آئین میں صدر کو ہمہ مقتدر بنا دیا گیا اور یوں صدارتی نظام کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۶۸ء میں پھر پارلیمانی نظام حکومت کی بحالی کا شور مچا چنانچہ ایوب خان کو مستعفی ہونا پڑا

اور ملک پھر مارشل لاء کی زد میں آ گیا۔ پھر کئی اندوہناک بحرانوں سے گزرنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں قوم کو نیا آئین ملا۔ یہ دستور وفاقی اور پارلیمانی طرز پر بنایا گیا تھا۔ صدر کے اختیارات کو پھر محدود کر دیا گیا اور اختیارات کا سرچشمہ وزیراعظم کو بنا دیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں پیپلزپارٹی کے خلاف پی این اے کی تحریک چلی تو پہلی مرتبہ عوامی سطح پر احساس ہوا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس طرح کے بحرانوں سے نپٹنے کیلئے کوئی طریقہ کار موجود ہی نہیں۔ چنانچہ بے بس اور بے اختیار صدر اس بحران پر قابو نہ پا سکے اور ملک پر پھر مارشل لاء مسلط ہو گیا۔

۱۹۸۵ء میں جب آئین بحال ہوا تو صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے کیلئے کچھ ترامیم کی گئیں جن میں آٹھویں ترمیم قابل ذکر ہے۔ اس ترمیم نے صدر اور وزیراعظم کے مابین اختیارات کی کشمکش میں صدر کا پلڑا پھر بھاری کر دیا ہے۔ انہی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جب ۱۹۸۸ء میں صدر ضیاء الحق نے اور ۱۹۹۰ء میں صدر غلام اسحٰق خان نے اسمبلیاں توڑیں تو صدر کے اختیارات کا طلسم سب پر آشکار ہو گیا۔ اگر غور کریں تو ۱۹۵۶ء سے صدر اور وزیراعظم کے مابین شروع ہونے والی اختیارات کی کشمکش کی یہ تاریخ خود اس بات کی آئینہ دار ہے کہ ہمارے سیاسی حالات اور ہمارا قومی مزاج ہمیں غیر محسوس طور پر پارلیمانی نظام سے صدارتی نظام کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ویسے بھی صدراتی نظام ہی خلافت راشدہ کے دور میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست کی ہیئت کے قریب تر ہے۔

مسئلہ عورت کی سربراہی کا

آٹھواں نکتہ عورت کی سربراہی سے متعلق ہے۔ اس مسئلہ پر اس دور میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ ہم نے بھی حتی الوسع اس کا مطالعہ کیا ہے۔ فریقین کی آراء ودلائل وزنی ہیں۔ اس لئے ہم کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ اس سلسلہ میں ہماری گذارش یہی ہے کہ موجودہ اور معروضی حالات سے بالاتر ہو کر اس مسئلہ پر غور وخوض کیا جانا ضروری ہے۔ ہم بھی اس مسئلہ پر مطالعہ جاری رکھے ہوئے ہیں' جونہی کسی حتمی نتیجہ پر ہم پہنچ جاتے ہیں' اپنی آزادانہ اور دیانتدارانہ رائے عرض کر دینگے۔

غیر مسلموں کا مشاورتی بورڈ

نواں نکتہ غیر مسلموں کی حیثیت سے متعلق ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو اس سے قبل ہو چکی ہے۔ جہاں تک اقلیتی مذاہب کی ایک مشترکہ مجلس مشاورت بنانے یا مختلف مذاہب سے متعلق لوگوں کے علیحدہ علیحدہ مشاورتی بورڈ تشکیل دینے کا تعلق ہے' ہمیں مؤخرالذکر صورت سے اتفاق ہے۔ کیونکہ اول الذکر صورت اسلامی ریاست کے خلاف باغیانہ طرز عمل کو فروغ دے سکتی ہے۔

ہماری رائے

یہ تو تھے وہ دستوری نکات جو ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمائے۔ رہ گیا مسئلہ ان دستوری نکات کو پاکستان کے آئین میں شامل کرانے کا تو اس سلسلہ میں ہماری گذارشات یہ ہیں کہ:

i۔ صرف ان دستوری نکات پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ پورے کے پورے آئین پاکستان کو قرآن وسنت کے تابع بنانے کی مساعی کی جائے۔ جب دستور کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا خیال آ ہی گیا ہے تو پھر چند نکات پر اکتفا کیوں کیا جائے کیونکہ شر کی معمولی آمیزش بھی خیر کو آلودہ کر دیتی ہے۔ اور اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق وباطل نہ کر قبول

ہم نے پہلے اس موضوع پر کام شروع کر رکھا ہے۔ لہٰذا ہم اس سلسلہ میں تعاونو علی البر کے تحت اپنا عملی تعاون پیش کرنے میں متامل نہیں۔

۲۔ اگر سیاسی جماعتوں کی جدوجہد' طریق کار اور کارکردگی پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آئین پاکستان میں یہ ترامیم پارلیمنٹ کے ذریعے شاید کبھی بھی نہ ہو سکیں۔ اسکے لئے عوامی تحریک کا آغاز کرنا اچھا خیال ہے لیکن اس تحریک کے آغاز سے قبل ہمیں چند باتوں کو بطور خاص ملحوظ رکھنا ہو گا۔ اول یہ کہ تحریک چلانے سے قبل علمی وفکری سطح پر بھرپور تیاری کی جائے۔ آئین پاکستان کا متبادل مسودہ تیار کیا جائے اور اس مسودے کو خاص وعام کے سامنے رکھا جائے تاکہ ہر کوئی متبادل مسودہ پر اپنی رائے دے سکے۔ ثانیاً وقیع علمی آراء کو قبول کیا جائے اور مسودے میں ضروری ترامیم کرنے میں بخل سے کام نہ لیا جائے تاکہ ملک کے باشعور طبقے کو قلباً وقالباً اس تحریک میں شامل کیا جا سکے۔ ثالثاً انبیاء کے طریق دعوت پر سب سے پہلے یہ مسودہ ملک کی پارلیمنٹ کو پیش کیا جائے اور اسے دعوت دی جائے کہ وہ حق کو قبول کرتے ہوئے جمہوری عمل کے ذریعے نئے آئین کے اس مسودے کی منظوری دیدے۔ رابعاً ہر طرح کے اہتمام حجت کے بعد کامل دردمندی اوراخلاص کے ساتھ جملہ تحریکی تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے عوامی تحریک کا آغاز کیا جائے۔

بقیہ تنظیم اسلامی کا موقف

ایک جیسے ہیں کوئی خاص فرق نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا سیاسی اثر بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ علاقوں میں ہے۔ جے یو آئی کا سیاسی حلقہ اثر اس پختون پٹی میں ہے جہاں جے یو پی کا کوئی عمل دخل نہیں اور جے یو پی کا اثر کراچی اور حیدر آباد میں ہے جہاں جے یو آئی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ تو اس اعتبار سے ایک باہمی سہولت کا اتحاد بھی ہو سکتا ہے جس کو Marriage of Convenience کہتے ہیں۔ بہرحال اس وقت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دینی اور مذہبی جماعتوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کسی سیکولر جماعت سے اتحاد نہ کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام انتخاب کے ذریعے نہیں بلکہ اگر آئے گا تو انقلاب کے ذریعے سے اور انقلاب منہج انقلاب نبوی کے ذریعے سے آئے گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ ہم نے اپنی جسم وجان کی صلاحیتیں اس کام کے لئے وقف کی ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ۶۷ء میں ضعیف رائے اور ڈاکٹر مبشر حسن جیسے حضرات کی کوشش میں بھی شرکت اختیار نہیں کی کیونکہ محض جمہوریت کے لئے کام کرنے کے لئے میرے پاس فارغ وقت نہیں ہے۔ میں تو اسلام کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں۔ اسلام آئے گا تو اصل جمہوریت آئے گی جو حقیقت میں جمہوریت ہوگی تب ہی اس کی اصل برکات کا ظہور ہوگا۔ موجودہ حالات میں جمہوریت کی حمایت جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کی حمایت ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں اور میں اپنے آپ کو اس کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ چونکہ مارشل لاء اس سے بھی بری چیز ہے اس لئے اس کے مقابلے میں کہتا ہوں کہ وہ موجودہ سیاسی عمل جاری رہنا چاہیے ورنہ ہماری جدوجہد اسلام کے عالی غلبے کے لئے رہے گی اور وہ عالی غلبہ ان شاء اللہ ہو کر رہے گا۔○○

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید اور علامہ اقبال

(قسط اول)

ڈاکٹر اسرار احمد

(نوائے وقت کے شکریئے کے ساتھ)

علامہ اقبال نے یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کو روح قرآن کا ظہور اور بروز' اور عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تصور کو نور محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ماخوذ اور مستعار قرار دینے' اور اسلام کے علم کلام کو افلاطونی تصورات کی دلدل اور ارسطو کی منطق کی بھول بھلیوں سے نکال کر جدید تجرباتی علوم کی اساس پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب مغرب کے دو جدید عمرانی نظریات اور بنیادی سیاسی تصورات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مغربی تہذیب کو پوری خود اعتمادی اور جرات رندانہ کے ساتھ چیلنج کیا' اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی پوری "مجددانہ" شان کے ساتھ از سر نو تدوین کا فریضہ سرانجام دیا اور اللہ اور رسولؐ کے عطا کردہ نظام عدل اجتماعی کو عہد حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر اور حقوق انسانی کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا' بلکہ انقلاب کا زوردار نعرہ لگاتے ہوئے اس کے منہج اور منہاج کو بھی کمال اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا۔

مغرب کے جن دو جدید عمرانی نظریات پر علامہ نے شدید تنقید کی وہ سیکولرزم اور نیشنلزم یعنی وطنی قومیت ہیں۔ اور ان کے ضمن میں علامہ کے خیالات اتنے واضح و بین اور معروف و مشہور ہیں کہ یہاں ان کی جانب صرف ایک اجمالی اشارہ کافی ہے۔ چنانچہ سیکولرزم علامہ کے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا فتنہ اور دین اور سیاست کی علیحدگی کے فساد کی اصل جڑ ہے۔ مزید برآں انسانی حاکمیت کا تصور علامہ کے نزدیک کفر اور شرک ہے' قطع نظر اس سے کہ وہ شخصی اور انفرادی ہو یا قومی اور عوامی۔ اس موضوع پر علامہ کے مشہور اور عام فہم اشعار میں سے تو یہ دو شعر سب سے زیادہ نمایاں ہیں:۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہوں دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

اور۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری' ہوس کی وزیری!

لیکن زیادہ لطیف انداز اور گہرے پیرائے میں یہ بات علامہ کی حیات مستعار کے بالکل آخری دور کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!

گویا علامہ کے نزدیک یورپ میں احیاء العلوم اور اصلاح مذہب کی تحریکوں کے زیر اثر آدم میں جو "خود شناسی" اور "خود نگری" کا شعور پیدا ہوا' وہ اصلاً تو درست تھا لیکن اسے ابلیس اور اس کے کارندوں نے "عوامی حاکمیت" کی صورت دے کر شیطنت کا سب سے بڑا مظہر اور ابلیس کا آلہ کار بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو گندگی منوں اور ٹنوں کے حساب سے ماضی میں کسی فرعون اور کسی نمرود یا کسی قیصر اور کسی کسریٰ کے سر پر تاج کی صورت میں رکھی ہوتی تھی وہ آج تولہ تولہ یا ماشہ ماشہ ہر انسان کے سر پر لیپ دی گئی ہے' لیکن نجاست بہرحال نجاست ہے' خواہ منوں اور ٹنوں کے حساب سے ہو' خواہ تولوں اور ماشوں کی مقدار میں!

رہا وطنی قومیت کا جدید تصور تو اس کے ضمن میں تو واقعہ یہ ہے حضرت علامہ نے بارہ اشعار پر مشتمل جو نظم اردو میں کہی اور تین اشعار پر مشتمل جو قطعہ فارسی میں کہا ان کے بارے میں میں پورے وثوق کے ساتھ وہی بات کہنے کو تیار ہوں جو امام شافعیؒ نے سورۃ العصر کے بارے میں کہی ہے---

اس موضوع پر امام شافعیؒ کا زیادہ مشہور قول تو یہ ہے کہ "اگر لوگ صرف اس سورت پر تدبر کر لیں تو یہ ان (کی ہدایت) کے لئے کافی ہے!" لیکن ان کا ایک دوسرا زیادہ فصیح اور بلیغ قول وہ ہے جو مفتی محمد عبدہ نے اپنی تفسیر پارہ عم میں نقل کیا ہے' یعنی: "اگر قرآن میں سوائے اس ایک سورت کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تب بھی یہ (لوگوں کی ہدایت) کے لئے کافی ہوتی!"---- علیٰ ہذا القیاس مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ اگر علامہ مرحوم نے ساری عمر میں صرف یہی اشعار کہے ہوتے تب بھی وہ خود اپنے ہی شعر۔

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بات کو ملا دے

کے مصداق مغربی تمدن کے لئے سب سے بڑے "بت شکن" اور "قومیت اسلام" کے مجدد اعظم قرار پانے کے مستحق ہوتے!

اس معاملے میں بھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت علامہ نے اپنی اردو نظم (مشمولہ "بانگ درا" صفحات ۱۶۰۔۱۶۱) میں ایک "سیاسی تصور" کی حیثیت سے "وطن" کو ایک جانب عہد حاضر کے "تازہ خداؤں" میں سب سے بڑا خدا اور تہذیب جدید کے آزر کے تراشے ہوئے نئے اصنام میں سب سے بڑا "صنم" قرار دیا گویا "وطنیت" کو سب سے بڑے شرک سے تعبیر کیا جو از روئے قرآن ناقابل معافی جرم ہے (سورۂ نساء آیات ۴۸ اور ۱۱۶) اور دوسری جانب نوع انسانی کے لئے نہایت تباہ کن اور مہلک بیماری قرار دیا۔ جس کے بطن سے "مخلوق خدا" میں تفرقہ و عداوت اور "اقوام جہاں" میں باہمی "رقابت" جنم لیتی ہے' جس کے نتیجے میں سیاست اخلاق سے "خالی" اور "تجارت" ذریعہ "تسخیر" (یعنی امپیریلزم کا آلہ) بن جاتی ہے--- اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ "کمزور" اقوام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا گھر "غارت" ہو جاتا ہے!

رہا فارسی قطعہ تو اس کے ضمن میں اگرچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا یہ اعتراض تو بالکل بجا تھا کہ "میں نے ملت نہیں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا!" اور اس پر حضرت علامہ نے بھی نہایت وسعت قلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کر لی تھی۔ لیکن مولانا مدنیؒ کے اس قول کے بارے میں کہ "میرا یہ کہنا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں محض خبریہ تھا' انشائیہ نہیں تھا" ان کی تمام تر جلالت قدر' اور

ان کے تقویٰ و تدین اور مجاہدانہ سیرت و کردار کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بالکل مہمل بات تھی اس لئے کہ مولانا ایک سیاسی اور مذہبی قائد تھے اور اس اعتبار سے ان کی ہر بات میں "انشاء" اور مشورہ کا رنگ ہونا بالکل فطری امر تھا۔

اور علامہ اقبال کی تنقید بھی اصلاً مغرب کے اس نظریئے ہی پر تھی کہ قوم وطن سے بنتی ہے! (ملت کا لفظ تو غالباً" صرف ضرورت شعری کے تحت استعمال ہوگیا تھا۔) اور کفر اور شرک ایسے امراض ہر دور میں جو نئے لباس پہن کر اور نت نئے بھیس بدل کر اولاد آدم کی گمراہی کے درپے ہوتے ہیں ان کی۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت رامی شناسم!

کے انداز میں صحیح پہچان کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہوتا ہے جو اس دور میں مبدء فیض سے علامہ اقبال کو عطا ہوا تھا---- بقول خود ان کے کہ۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ!

قصہ مختصر' ایک جانب سیکولرزم اور عوامی حاکمیت اور دوسری جانب وطنی قومیت کی پر زور نفی کی اساس پر علامہ اقبال نے تہذیب جدید اور تمدن کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ "خبردار" بھی کیا کہ۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا!

اور۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا!

اس مقام پر آگے پڑھنے سے قبل یہ جملہ معترضہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جارہا کہ "مسلم قومیت" کی اساس پر وجود میں آنے والے ملک میں' جس کے لئے ساری سیاسی جنگ "جداگانہ انتخابات" کی بنیاد پر لڑی گئی تھی' پینتالیس سالہ تعطل کے نتیجے میں نظریاتی انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت یعنی پاکستان پیپلزپارٹی تو بر ملا "مخلوط انتخابات" کا نعرہ لگا رہی ہے' زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بھی بعض سیکولر مزاج کارکن اور رہنما کم از کم نظریاتی سطح پر اسی کے راگ میں اپنی راگنی شامل کررہے ہیں' اور نوبت بایں جارسید کہ۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ

اور۔

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں شناختی کارڈ میں "مذہب" کے خانے کے اندراج پر اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوا ہے کہ مذہبی جماعتوں کو ایجی ٹیشن کی دھمکی دینی پڑ رہی ہے!---- رہا قائداعظم مرحوم کا ۱۱ر اگست ۴۷ء والا جملہ تو اسے ایک وقتی مصلحت کے طور پر قبول کرنا تو بالکل دوسری بات ہے لیکن اگر مستقل فلسفے اور پاکستان کے دستور اور نظام کی مستقل اساس کے طور پر تسلیم کرلیا جائے تو یہ "نظریہ پاکستان" کی صریح نفی اور مفکرو مصور پاکستان کے افکار و نظریات سے کھلی بغاوت ہے! جو نظریاتی سطح پر پاکستان کے جواز کے خاتمے اور 'خاکم بدہن' بالآخر عملی طور پر سوویٹ یونین کے مانند پاکستان کے بھی نیست و نابود ہونے پر منتج ہوگی جبکہ پاکستان کی اس نظریاتی اساس کا استحکام اور اسی کی بنیاد پر ملک کے پورے دستوری اور قانونی نظام کی تشکیل عالم انسانیت میں ایک نئی تہذیب کے رواج' ایک نئے تمدن کے قیام و فروغ' اور اس "نیو ورلڈ آرڈر" کی بجائے جو حقیقت کے اعتبار سے "جیو ورلڈ آرڈر" یعنی یہود کی بالادستی کا نظام ہے' ایک حقیقی اور واقعی منصفانہ عالمی نظام (جسٹ ورلڈ آرڈر) کے قیام کا نقطہ آغاز بن جائے گی۔ اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جو ابلیس لعین اور اس کی تمام صلبی اور معنوی ذریت (اولاد) اور یہود اور ان کے آلہ کار "وہائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنس" (واسپ) کو ناپسند ہے' لہٰذا پاکستان میں اس منزل مقصود کی جانب کوئی چھوٹے سے چھوٹا' اور حقیر سے حقیر اقدام بھی ابلیس اور اس کے ملکی اور غیر ملکی کارندوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے!

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" نامی نظم حضرت علامہ نے ۱۹۳۶ء میں اپنے انتقال سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال قبل کہی تھی اور ان کے اردو کلام میں شعریت کے اعتبار سے تو بعض دوسری نظمیں اس کے مقابلے میں بہت بلند مرتبہ و مقام کی حامل ہیں' لیکن "امت مسلمہ کے نام پیغام" کے اعتبار سے' اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ' اسی کو ان کے "خاتمہ کلام" اور "پیام آخریں" کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کا "حاصل کلام" یا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ ابلیسیت کو کوئی خطرہ نہ جمہوریت سے ہے' نہ اشتراکیت سے بلکہ صرف اور صرف اسلام سے ہے۔ اس لئے جہاں تک مغرب کی نام نہاد جمہوریت کا تعلق ہے وہ محض "ملوکیت کا اک پردہ" ہے اور اس کی حقیقت ع
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر" کے سوا اور کچھ نہیں (اس لئے کہ وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے "سرمایہ داروں کی آمریت" ہے) اسی طرح اشتراکیت بھی قدیم "مزد کی منطق کی سوزن" سے نوع انسان کے گریبانوں کے چاک کو رفو نہیں کرسکتی' بقول ابلیس۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روز گار' آشفتہ مغز' آشفتہ ہو!

لہٰذا۔

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو!

اور۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے!

اسلام سے اس خوف اور خطرے کے مقابلے میں ابلیس کو اگرچہ یہ تسلی اور اطمینان حاصل ہے کہ ایک جانب تو مسلمانوں کی عمل کے اعتبار سے حقیقی اور واقعی صورت حال یہ ہے کہ۔

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں!

اور۔

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں!

اور دوسری جانب نام نہاد "اہل ایمان" کے ایمان کی واقعی کیفیت یہ ہے کہ وہ "یقین" کی بجائے محض ایک "عقیدہ" بن کر رہ گیا ہے یعنی۔ "یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں!" اور۔

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام!

تاہم چونکہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ لامحالہ "تلاش مصطفیٰ" کی جانب ہے لہٰذا ابلیس کو یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ۔

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ ہوجائے آشکارا شرع پیغمبرؐ کہیں!

معذرت

"ندائے خلافت" کا ایک اور شمارہ اس دوران میں غائب ہوگیا۔ اس بے قاعدگی کے اسباب تو ہیں لیکن ہم معذرت پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ دعا کیجئے کہ مسبب الاسباب ان اسباب کو دور کردے۔۔

(ادارہ)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36 -K,Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

امت مسلمہ کے یہ "اکابرین"

عمر مختار

سلطان برونائی پچھلے دنوں عین اس موقع پر پاکستان تشریف لائے جب یہاں سیلاب اور بارشوں نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ انہوں نے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے جیب خاص سے ایک عطیہ بھی دیا تھا' ٹھیک سے یاد نہیں کہ کتنی مالیت کا تھا لیکن تھا ہزاروں ڈالروں میں ہی۔ اس پر دل کو ٹھیس سی لگی تھی' سوچا کہ اونٹ کے منہ میں زیرہ دینے میں شاید ان کی حس مزاح کا دخل ہو لیکن جب سے یہ پڑھا کہ انہوں نے بوسنیا ہرزیگووینا کے مظلوم مسلمانوں کو حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے ایک ملین یعنی دس لاکھ ڈالر کی "خطیر" رقم امداد دی ہے تب سے صبر آگیا ہے---- نام بڑے اور درشن چھوٹے!

۱۹۶۷ء میں برونائی کے تخت پر بیٹھنے والے سینڈ ہرسٹ کے تربیت یافتہ سلطان کا پورا نام ایک سانس میں پڑھ لیا جانا ممکن نہیں۔ ان کا اسم گرامی " کباوا دولی یانگ ماہا مولیا پدوکا سری بگندا سلطان حاجی حسن البولکیا معز الدین والدولہ ابن المرحوم سلطان حاجی عمر علی سیف الدین سعادت الخیرالدین" ہے۔ سلطان کو دنیا کے امیر ترین انسان ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور ان کی دولت کا تخمینہ ۳۷ بلین ڈالر (نو کھرب تیس ارب پاکستانی روپے) ہے۔ وہ خیر کے کاموں پر "دل کھول کر" خرچ کرتے ہیں۔ بوسنیا کے المیہ نے ان کی جیب سے دس لاکھ ڈالر نکلوا لئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے ۱۹۸۵ء میں سینڈ ہرسٹ کے نیشنل آرمی میوزیم کو ساڑھے تین لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ (سوا پانچ لاکھ ڈالر) اور امپیریل وار میوزیم کو بھی ڈھائی لاکھ پاؤنڈ (پونے چار لاکھ ڈالر) کے عطیات دئے تھے۔ وہ اس معاملے میں رنگ و نسل اور دین و مذہب یا قومیت کے کسی تعصب کو بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتے چنانچہ ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ء کو نیویارک ٹائمز نے میئر کاچ کے ساتھ ان کی تصویر اس اطلاع کے ساتھ شائع کی تھی کہ ایک نوزائیدہ قوم کے سلطان نے نیویارک شہر کے معمر یہودیوں کے لئے ایک تحفہ دیا ہے۔ یہ تحفہ ان کی طرف سے اس فنڈ میں پانچ لاکھ ڈالر کا چندہ تھا جو امریکی عروس البلاد کے ان تین ہزار سات سو بوڑھے یہودیوں کو ہفتہ واری چھٹیوں اور تہواروں میں کھانا پہنچانے کے لئے قائم کیا گیا تھا جنہیں بڑھاپے نے گھروں میں محبوس کر کے رکھ دیا ہے۔

ان کے ایک "ٹی پارٹی گفٹ" کا بھی بہت شہرہ ہے جو انہوں نے سابق وزیراعظم برطانیہ' مارگریٹ تھیچر کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کی غرض سے دیا تھا۔ ان دنوں پاؤنڈ کی حالت بہت خراب و خستہ تھی اور اس میں سلطان برونائی کا برطانوی بنکوں میں اپنے اثاثوں میں سے کچھ رقم باہر لے جانا بھی ایک عامل تھا۔ مارگریٹ تھیچر نے سلطان کو بلا بھیجا اور اپنے دفتر کے عام سے برتنوں میں انہیں چائے پیش کرنے کے بعد بڑے چاؤ سے فرمائش کی کہ وہ اس رقم کو واپس منگوالیں جو انہوں نے برطانیہ سے نکال لی ہے۔ سلطان کا دل پسیج گیا اور انہوں نے اپنے ہوٹل واپس پہنچتے ہی اپنے بنکار کو ہدایت جاری کردی کہ ان کی وہ پوری رقم امریکی بنکوں سے واپس برطانوی بنکوں میں لے آئی جائے جو یہاں سے منتقل ہوئی ہے۔ یہ رقم پانچ ارب پاؤنڈ (ساڑھے سات ارب امریکی ڈالر) تھی۔

☆ ☆ ☆

برطانیہ کی گھڑ دوڑ "انڈسٹری" کو حال ہی میں دوبئی (متحدہ عرب امارات) کے شاہی خانوادے کی طرف سے یہ دھمکی موصول ہوئی ہے کہ یہاں ریس کے کاروبار کی صورت حال بہتر نہ ہوئی تو وہ اپنے گھوڑے یہاں سے فرانس' آئرلینڈ یا کسی اور ملک میں لے جائیں گے جہاں کیفیت اس اعتبار سے بہت بہتر ہے کیونکہ برطانیہ میں تو مقامی ٹیکسوں نے شہزادوں کا ناک میں دم کردیا ہے اور اس پر یہ ستم مستزاد کہ ریس سے آمدنی بھی کچھ بہت زیادہ نہیں۔

آپ شاید جاننا چاہیں گے کہ دوبئی کے شیخ محمد بن راشد المکتوم اور ان کے بھائی مکتوم' حمدان اور احمد کے برطانیہ میں گھوڑوں کے اصطبل کا خرچ کیا ہے تو جگر تھام کر سنئے کہ ریس کے ان گھوڑوں پر شاہی خاندان کو ہر سال ایک ارب سے لے کر دو ارب ڈالر تک خرچ کرنے پڑتے ہیں اور یہ معمول آج سے نہیں' ستر کے عشرے کے وسط یعنی پچھلے سترہ سال سے چلا آتا ہے۔

☆ ☆ ☆

بھارت کے سابق نائب صدر' محمد ہدائت اللہ کو بعد از مرگ ہندوانہ طریقے سے چتا میں جلایا گیا تو شاید اس لئے کہ ان کی میت اپنی ہندو بیوہ (جو آخر تک اپنے دھرم پر قائم رہی) کے رحم و کرم پر تھی کیونکہ خود نوشت سوانح عمری میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی بیٹی جس کا ساٹھ کے عشرے کے آخر میں لندن میں انتقال ہوا' مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کی گئی گویا وہ کم از کم اس وقت تک تو "مسلمان" ہی تھے اور بعد میں بھی ان کے ترک اسلام کے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ مسلمانوں کو غیر مسلم عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت نہیں تاکہ اس طرح کے سانحے نہ ہوں' اجازت ہے تو کتابیہ خواتین کو نکاح میں لانے کی کیونکہ ان کے ہاں بھی تدفین ہی کی کوئی شکل رائج ہے۔

لیکن اہل کتاب میں مذہب کی کون سی پابندی باقی رہ گئی ہے! مشہور پاکستانی شاعرن م راشد کی یورپی بیوی نے اپنے مسلمان(؟) شوہر کی میت کو آگ میں جھونک کر خاک کروادیا تھا اور شاید متوفی کی اپنی خواہش بھی یہی تھی۔

☆ ☆ ☆

لبنان جیسے لٹے پٹے ملک میں بھی نئی حکومت کو جو مسلمان وزیراعظم حال ہی میں ملا' وہ خیر سے ارب پتی ہے۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ وہاں ایک معاہدے کے تحت ۱۹۴۳ء سے یہ انتظام چلا آتا ہے کہ ملک کا صدر ہمیشہ کوئی ماروئی کیتھولک عیسائی ہوگا' وزیراعظم ایک سنی مسلمان اور پارلیمنٹ کا سپیکر ایک شیعہ مسلمان۔

نئے وزیراعظم رفیق حریری کم سے کم نو عرب اور فرانسیسی بنکوں میں حصہ دار ہیں۔ انہیں مشہور جریدے "فوربس" نے بعد از تحقیق دنیا کے ایک سو امیر ترین آدمیوں میں شمار کیا ہے اور ان کی ذاتی دولت تین ارب ڈالر سے زیادہ ہے جو طویل خانہ جنگی کے دوران بھی کم نہیں ہوئی' بڑھی ہے۔